Quarterly Journal
of the
Qur'an Academy

Patron: Dr. Israr Ahmad

The Qur'anic Horizons

Price per issue: Rs. 30/- Annual Subscription: Rs. 100/-

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an
36-K, Model Town, Lahore-54700

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۵ | رمضان۔شوال ۱۴۱۶ھ فروری مارچ ۱۹۹۶ء | شمارہ ۲/۳

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ادارہ منزل متصل شاہ بکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون ۸۰/- روپے، فی شمارہ ۸/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

اس شمارے کی قیمت: ۱۴ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف اول

نیویارک میں "انسٹی ٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم" کے قیام کی تجویز

مرکزی انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس سال ماہ رمضان المبارک کا بڑا حصہ فلشنگ' نیویارک کے مسلم سنٹر کی نئی تعمیر شدہ بلڈنگ میں گزارا' جہاں احباب کے شدید اصرار پر انگریزی زبان میں دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ اس نئے مسلم سنٹر میں دعوت قرآنی کے کام کا آغاز گویا اسی دورۂ ترجمہ قرآن سے ہوا۔ بحمد اللہ یہ پروگرام پہلے سے طے شدہ شیڈول کے مطابق بحسن و خوبی سرانجام پایا اور پندرہ پاروں کی حد تک انگریزی زبان میں ترجمہ قرآن اور مختصر تشریح کی آڈیو وڈیو ریکارڈنگ کا کام مکمل ہوا جس کا امریکہ میں مقیم ہمارے رفقاء و احباب کی جانب سے گزشتہ کئی برسوں سے شدید تقاضا تھا۔ اور اس طرح قرآن حکیم کی حکمت پر مبنی دعوت اور اس کے انقلابی فکر کی انگریزی زبان میں منتقلی کا ایک حد تک سامان ہو گیا کہ جس کی ترویج و اشاعت کے لئے ہی مرکزی انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔

مسلم سنٹر کی انتظامیہ کے جذبہ تعاون' دینی لگن اور قرآن حکیم کے ساتھ ان کے تعلق خاطر کو دیکھتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اس نئے سنٹر کو "حکمتِ قرآنی" کی اشاعت کا مرکز بنایا جائے اور اسے دوسرے سنٹرز کی طرح محض ایک سنڈے (Sunday) سکول بنانے کی بجائے کہ جہاں صرف بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے' تعلیم بالغاں کا ایک مؤثر مرکز بھی بنایا جائے جہاں عاقل و بالغ افراد کو عربی زبان کی تعلیم دینے اور قرآن حکیم کے فکر و فلسفہ اور اس کی تعلیمات سے روشناس کرانے کا مناسب انتظام ہو۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس کے لئے Institute of Quranic Wisdom (انسٹی ٹیوٹ آف قرآنک وِزڈم) کا نام تجویز کیا اور اس ضمن میں ایک اجمالی نقشہ کار بھی انتظامیہ میں شامل اہم عہدیداران کے سامنے رکھا جس میں تفصیلات کا رنگ بعد میں باہم مشورے سے بھرا جا سکتا ہے۔ بحمد اللہ سنٹر کی انتظامیہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور اصولی طور پر اس انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی منظوری دے دی۔ توقع ہے کہ فلشنگ کا یہ مسلم سنٹر شمالی امریکہ میں دعوت قرآنی کا ایک اہم مرکز ثابت ہو گا۔ السعی منا والاتمام من اللّٰہ ○○

سلسلۂ تقاریر "تعارف الکتاب"

ڈاکٹر اسرار احمد

قَالَ الْمَلَأُ

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ۟ (الاعراف: ۸۸)

قرآن مجید کا نواں پارہ "قَالَ الْمَلَاُ" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ اس پارے میں اوّلاً سورۃ الاعراف کی بقیہ ایک سو انیس آیات وارد ہوئی ہیں اور اس کے بعد سورۃ الانفال کی چالیس آیات۔ پارے کی ابتدا میں وہی مضمون ہے جو سورۃ الاعراف میں سابقہ پارے میں جاری تھا، یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر۔ اور اس کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کا ذکر شروع ہوا۔ فرعون کے ساتھ آپؑ کی کشمکش، مصر میں جن شدائد و مسائل سے وہ اور بنی اسرائیل دوچار تھے، اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے فرعون کے انتہائی شدید عذاب اور اس کی طرف سے شدید مصیبت سے نجات ہوئی، ان حالات و واقعات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا۔ ساتھ ہی یہ واقعہ بھی بیان ہوا کہ فرعون کے عذاب سے نجات پانے کے فوراً بعد یہ بدبخت قوم شرک میں مبتلا ہو گئی۔ جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر طلب فرمایا تاکہ انہیں تورات عطا کی جائے تو ان کے پیچھے بنی اسرائیل بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ گویا

کہ انجیل ہی کے الفاظ کے مطابق یہ وہ قوم تھی جس نے پہلی ہی شب میں بے وفائی کی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہوں نے اس پر انتہائی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شدید سزا بھی اس قوم کو ملی۔ اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے ستر سرکردہ افراد کو لے کر اجتماعی توبہ کے لیے حاضر ہوئے۔ اس موقع پر جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے استغفار فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا کہ جہاں تک میری رحمت کا تعلق ہے وہ اگرچہ عام ہے تمام اہلِ ایمان کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جن سے اگر گناہ سرزد ہو جائے تو وہ توبہ کریں' رجوع کریں' لیکن میری رحمت کا خاص حصہ ان کو ملنے والا ہے جو نبیِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔ اس ضمن میں چند الفاظ بڑے جامع آئے ہیں۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۵۷)

یعنی وہ لوگ جو ہمارے اِس نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے ان کا احترام کریں گے، ان کا ادب کریں گے' ان کی نصرت کریں گے۔ ان کے مسلک کی پیروی کریں گے فرائضِ رسالت کی ادائیگی میں ان کے دست و بازو بنیں گے' ان کے مشن کی تکمیل میں مددگار بنیں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ہم ان کے ساتھ نازل کریں گے یعنی قرآن مجید' یہ لوگ ہوں گے جو حقیقی فلاح سے دوچار ہوں گے۔

ان الفاظ میں ہم مسلمانوں کے لیے بھی بڑی راہنمائی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ حقوق ہیں جو ہم میں سے ہر شخص پر عائد ہوتے ہیں۔ آپؐ پر ایمان، آپؐ کی تصدیق، آپؐ کا ادب' آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے جان و مال کا کھپانا، وہ دین جو آپؐ لے کر آئے تھے' جس کے بارے میں مولانا حالی نے بڑے درد انگیز پیرائے میں کہا کہ ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

اس دین کو دنیا میں غالب کرنا، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت ہے، اس کے لیے جان و مال کھپانا اور اس قرآن مجید کا اتباع کرنا، اللہ کی اس مضبوط رسی کو پوری مضبوطی کے ساتھ تھام لینا۔ یہ ہیں امّتِ مسلمہ میں سے ہر فردِ بشر کے فرائض جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ضمن میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔

سورۃ الاعراف اکثر و بیشتر تاریخ انسانی کے اہم واقعات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں ارواحِ انسانیہ سے جو عہد ازل میں لیا گیا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى (الاعراف: ۱۷۲) یعنی "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" اور سب نے اقرار کیا تھا کہ ہاں! جب کہ ارواحِ انسانی جنودٌ مجندہ کی شکل میں اپنے پروردگار کے سامنے حاضر تھیں' اس عہد کا بھی ذکر ہوا۔ ساتھ ہی تاریخ بنی اسرائیل کی ایک بڑی اہم شخصیت بلعم بن بعورہ کا ذکر ہوا ہے جسے اللہ نے بہت سا علم عطا کیا تھا: اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا (الاعراف: ۱۷۵) "ہم نے اسے اپنی آیات عطا فرمائیں"۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ "اور ہم چاہتے تو اسے مزید بلندی اور رفعتِ شان عطا فرماتے لیکن وہ بدقسمت زمینی خواہشات اور سفلی شہوات ہی کی طرف ملتفت ہو کر رہ گیا۔ اس کی مثال کتے کی سی ہے"۔

اس کے بعد سورۃ الانفال کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سورۃ مبارکہ مدنی ہے۔ اور پوری کی پوری سن ۲ھ ہجری میں غزوۂ بدر کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس سورۃ مبارکہ میں ہمارے دین کی دو بنیادی حقیقتوں کو بڑے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا۔ یعنی ایک ایمان اور دوسرے جہاد۔ چنانچہ آغاز ہی میں مؤمنینِ صادقین کے اوصاف کا ذکر ہوا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (الانفال: ۲، ۳)

یعنی مومن تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل لرز اٹھیں اور جب

انہیں ہماری آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کے ایمان اور یقین میں اضافہ ہو اور وہ اپنے ربّ ہی پر توکل کرتے ہوں اور وہ نماز قائم رکھتے ہوں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے ہمارے لیے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہوں۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ان لوگوں میں یہ اوصاف ہیں وہ ہیں حقیقت میں مومن۔

اس کے فوراً بعد غزوۂ بدر کا ذکر شروع ہو گیا۔ یہ انتہائی عظیم اور اہم معرکہ جس سے کہ کفر کو کھلی شکست ہوئی اور اسلام کو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم فتح عطا فرمائی' اس کا تفصیلاً ذکر ہوا۔ جن حالات میں یہ جنگ واقع ہوئی کہ مسلمانوں اور کفّار کے مابین بالکل کوئی نسبت نہیں تھی، یہ تین سو تیرہ اور بے سروسامان اور وہ ایک ہزار اور کیل کانٹے سے لیس۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فتحِ مبین عطا فرمائی۔ کفّار کے ستّر سردار سرزمینِ بدر پر کھجور کے کٹے ہوئے تنوں کی مانند پڑے ہوئے تھے۔ فرمایا گیا: مسلمانو! اس مغالطے میں نہ رہنا کہ یہ فتح تم نے اپنے زورِ بازو سے حاصل کی ہے: فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ ۪ (الانفال: ۱۷) "تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا۔" وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ "اور (اے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ نے جو کنکریوں کی مٹھی بھر کر کفّار کی طرف پھینکی تھی وہ آپؐ نے نہیں ہم نے پھینکی تھی۔" گویا کہ یہ فتح و نصرت تائیدِ خداوندی سے ہی حاصل ہوئی تھی اور اس کے لیے تم آئندہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے امیدوار رہ سکتے ہو۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ ﷺ:

((اِنَّ الرَّجُلَ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِہٖ مِنَ الْقُرْآنِ شَیْءٌ کَالْبَیْتِ الْخَرِبِ))

رواہ احمد والترمذی' وقال: حسن صحیح

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص کے سینے میں قرآن میں سے کچھ بھی محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کی مانند ہے۔"

وَاعْلَمُوْا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (الانفال، آیت ۴۱)

قرآن حکیم کا دسواں پارہ "وَاعْلَمُوْٓا" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ اس میں اولاً سورۃ الانفال کی بقیہ پینتیس ۳۵ آیات شامل ہیں اور اس کے بعد سورۃ التوبہ کا آغاز ہوتا ہے جس کی ترانوے ۹۳ آیات اس پارے میں شامل ہیں۔ سورۃ الانفال میں قتال فی سبیل اللہ کا مضمون پچھلے پارے سے چلا آ رہا تھا جس کا ہدف مقرر کیا گیا تھا ان الفاظِ مبارکہ سے کہ "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ" (الانفال: ۳۹) "کفار سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل صرف اللہ کے لیے ہو جائے"۔ یعنی انسانی زندگی اپنی تمام تفصیلات سمیت اللہ کی اطاعت کے تحت آ جائے۔ اس پارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ آپ اہلِ ایمان کو قتال کی تحریض دلائیں، انہیں ترغیب دیں۔ "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ" (الانفال: ۶۵) یعنی اے نبیؐ اہلِ ایمان کو قتال پر راغب فرمایئے، انہیں قتال فی سبیل اللہ پر ابھاریئے۔

اس سورۃ کے اختتام پر ایمانِ حقیقی کی تعریف کا دوسرا جزو آیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ

هَاجَرُوا وَجٰهَدُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (الانفال:۷۴)

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ کہ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی یہ ہیں اصل مومن حقیقی مومن" گویا کہ ایک حقیقی مومن کی جامع اور مانع تعریف اس سورۃ مبارکہ میں دو حصوں میں ہو کر آئی، پہلے حصے میں ایمان کے داخلی ثمرات ایمان کی قلبی کیفیات، عبادات کے ساتھ صرف اللہ پر توکل اور دوسرے حصے میں جہاد فی سبیل اللہ، ہجرت اور قتال فی سبیل اللہ۔ ان دونوں کو جمع کیا جائے تو ایک بندۂ مومن کی شخصیت کی پوری تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد سورۃ التوبہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ "براءۃ" بھی ہے، اس لیے کہ اس کا آغاز ہی اس لفظ سے ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا ہی میں وہ آیات وارد ہوئی ہیں کہ جن کے ذریعے مشرکینِ عرب سے اعلانِ براءۃ کر دیا گیا یہ درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کا اندرونِ ملکِ عرب کی حد تک تکمیلی مرحلہ ہے۔ اسی سورۃ مبارکہ میں وہ عظیم آیت وارد ہوئی ہے کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (التوبہ:۳۳) "وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو الہدیٰ یعنی قرآن مجید اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کرے اس کو پورے کے پورے دین پر۔ یہ ہے بعثتِ محمدیؐ کی اصل غرض و غایت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس مشن کو جزیرہ نمائے عرب کی حد تک بہ نفسِ نفیس مکمل فرمایا چنانچہ آپ کی تیئس سالہ محنت و مشقت اور جدّ و جہد کا تکمیلی مرحلہ ہے اندرونِ ملک عرب کی حد تک اس سورۃ مبارکہ میں اس کا ذکر بھی ہے، چنانچہ غزوۂ حنین کا ذکر بھی ہے کہ جو فتح مکہ کے بعد مشرکین عرب کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آخری مدافعت تھی، اور جس کے بعد پورے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی طاقت ایسی نہ رہی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں مزاحم ہو سکتی ہو۔ چنانچہ اگلے ہی سال سنہ ۹ ہجری میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلۂ حج کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت میں روانہ فرما چکے تھے، اس سورۃ مبارکہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا جنہوں نے آپؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے اجتماعِ

حج میں ان آیات کو پڑھ کر سنایا اور اعلان کر دیا کہ اشہرِ حرم کے خاتمے کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین کا قتلِ عام شروع ہو جائے گا: "فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" (التوبہ: ۵) 'جب یہ محترم مہینہ ختم ہو جائے تو مشرکین کو ختم کرو جہاں کہیں پاؤ'۔ یہ درحقیقت اس سنّت اللہ کی تکمیل تھی کہ رسولوں کے انکار کے بعد جن قوموں کی طرف رسولوں کو بھیجا جاتا ہے ان کے ساتھ رعایت نہیں کی جاتی۔ ان پر عذاب استیصال نازل ہوتا ہے کبھی عذاب آسمان سے نازل ہوتا ہے کبھی وہ ان کے قدموں کے تلے زمین سے پھٹ کر نکلتا ہے اور کبھی وہ اہلِ ایمان کی تلواروں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ساتھ ہی اس سورۂ مبارکہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت یا بالفاظِ دیگر انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا جو بین الاقوامی دور ہے اس کے آغاز کا ذکر ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد اطراف و جوانبِ عرب میں جو ملوک و سلاطین تھے سب کو دعوتی خطوط بھیجے تھے۔ ان دعوتی خطوط میں سے ایک خط حضرت حارث بن عمیرؓ، شرحبیل بن عمرو رئیس شام کے نام لے کر گئے تھے۔ حضرت حارث بن عمیرؓ کو اس رئیس شام نے قتل کر دیا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کے لیے ایک فوج بھیجی۔ یہ تین ہزار کا لشکر تھا جس کا مقابلہ شرحبیل بن عمرو کی ایک لاکھ کی فوج سے ہوا۔ یہ جنگِ موتہ کہلاتی ہے جو جمادی الاوّل ۸ھ میں واقع ہوئی۔ اگرچہ تین ہزار کی مختصر سی نفری کا ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ کوئی مقابلہ بنتا نہ تھا لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑی ہی حکمت کے ساتھ مسلمان فوج کو کفار کے نرغے سے نکال لائے۔ اس کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کا سفر اختیار فرمایا۔ آپؐ تین ہزار جاں نثاروں کے ساتھ شام کی سرحد تک پہنچے اور بیس دن تک آپؐ نے وہاں قیام فرمایا۔ ہرقل اگرچہ قریب ہی موجود تھا اور اس کے پاس لاکھوں کی فوج مجتمع تھی لیکن وہ مقابلے پر نہ آسکا۔ اور پورے علاقے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا۔ الغرض اس سفرِ تبوک کے ذریعے جس کی تفصیلات سورۃ التوبہ میں وارد ہوئی ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ میں دعوت و انقلاب اسلامی کے بین الاقوامی دور کا آغاز ہو گیا۔

اقامت صلوٰۃ قرآن حکیم کا موکد ترین حکم ہے
اور اس موضوع پر بے شمار چھوٹی اور بڑی کتابیں تحریر کی گئی ہیں
اس ضمن میں حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب

اِقامتُ الصَّلٰوۃ

ترتیب وتالیف :
پروفیسر محمد صدیق بن محمد یوسف
"بقامتِ کہتر و لے بقیمتِ بہتر" کا مصداق قرار دی جاسکتی ہے

جس میں طہارت اور وضو کے مسائل، نماز سے متعلق اصطلاحات کی تعریفیں اور ان کے شرعی احکام، نماز کی اہمیت کے بارے میں چند آیات قرآنی اور احادیث نبوی، نماز کے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کی تفصیل، حقیقت صلوٰۃ اور ارکان اسلام کے مقاصد جیسے اہم موضوعات شامل ہیں ---- مزید برآں وضو اور ارکان اسلام کی سائنسی توجیہات اس کتاب کا امتیازی موضوع ہے۔

کتاب کی فروخت سے ہونے والی آمدنی مدرسہ اشرفیہ حفظ القرآن اوگی (ضلع مانسہرہ) کے لئے وقف ہے۔

○ سفید کاغذ ○ کمپیوٹر کمپوزنگ ○ عمدہ طباعت ○ دیدہ زیب ٹائٹل
○ صفحات : ۱۱۲ ○ قیمت : ۳۰ روپے (طلبہ اور تاجر حضرات کیلئے ۲۰ روپے)

ملنے کے پتے :
۱۔ صدیق میڈیکوز، اوگی (ضلع مانسہرہ) ، فون : 48 اور 101
۲۔ میجر (ر) محمد محمود احمد، مکتبہ دارالسالکین، 16۔A نثار روڈ، لاہور کینٹ
فون : 373964

تعارفِ قرآن کریم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ نے قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ کے دورۂ ترجمۂ قرآن کے آغاز میں "تعارفِ قرآن کریم" کے موضوع پر اختصار کے ساتھ خطاب فرمایا تھا' جسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ہدیہ قارئین کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے چار خطابات بھی موجود ہیں' جن کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ دستیاب ہیں۔۔۔۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ' ادعیۂ ماثورہ اور موضوع سے متعلق آیات کی تلاوت کے بعد فرمایا کہ میری آج کی گفتگو کا موضوع "تعارفِ قرآن" ہے۔ میں انتہائی اختصار کے ساتھ قرآن کے تعارف کے حوالے سے اہم نکات کی وضاحت پر ہی اکتفا کروں گا۔

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا عقیدہ

عقیدہ کے حوالے سے تین باتیں بہت ہی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں' جو ہمارے ذہنوں میں مستحضر رہنی چاہئیں :

(i) یہ اللہ کا کلام ہے۔ میں یہاں لفظ "کلام" پر زور دے رہا ہوں۔

(ii) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

(iii) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔ یہ من و عن اسی حالت میں ہے جیسے کہ نازل ہوا تھا۔ اس میں نہ کوئی تحریف ہوئی ہے' نہ تو کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی نہ تو ترتیب میں واقع

ہوئی ہے اور نہ ہی اس کے متن میں۔ اس میں ہر چیز' جیسی کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے امت کو عطا فرمائی تھی' اسی حال میں محفوظ ہے' اور یہ تاقیامِ قیامت' بلکہ تاابد محفوظ رہے گا۔ یہ تین چیزیں ہمارے ذہنوں میں اس طرح نقش ہونی چاہئیں جیسے کہ پتھر پر لکیر۔

اب میں ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کچھ اختصار کے ساتھ عرض کروں گا۔

(i) قرآن اللہ کا کلام ہے

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' تو قرآن مجید میں سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۶ میں یہ لفظ آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾ گویا اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کو قرآن حکیم ہی میں اپنا کلام قرار دیا ہے۔ اب یہاں سے عظمتِ قرآن کا ایک بہت اہم نکتہ واضح ہوتا ہے۔ قرآن کی عظمت کو قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے بھی مختلف پیرائیوں میں اس عظمت اور فضیلت کو بیان کیا ہے۔ اس مقام پر خاص اس پہلو سے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' اس کی عظمت کا جو ایک رخ ہمارے سامنے آتا ہے' وہ یہ ہے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ قرآن اللہ کی صفت ہے۔ ہمارے ہاں متکلمین اور فلاسفہ میں اس مسئلے پر بڑی بحث رہی ہے کہ اللہ کی صفت کو اللہ کی ذات پر زائد مانا جائے یا اس کی ذات کا عین مانا جائے۔ جیسے کہ اقبال کے ایک شعر میں ہے۔

ہیں کلامُ اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

اور ع

ہیں صفات ذاتِ حق' حق سے جدا یا عینِ ذات؟

یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی جو صفات ہیں وہ اس کی ذات سے علیحدہ ہیں یا اس کی عین ہیں؟ اس بات پر متکلمین کا اجماع ہے "لاعَین ولاغَیر"۔ یعنی نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفاتِ باری

تعالیٰ اللہ کی غیر ہیں اور نہ ہی یہ کہ وہ عین ہیں۔ یہ جو باریک سا تعلق ہے اس کو ذہن میں رکھئے کہ قرآن مجید کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے ذات باری تعالیٰ سے اس قدر قرب رکھتا ہے کہ ہم اسے اس کا غیر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے اس کی عظمت واضح ہوتی ہے' جو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

یعنی صاف کہہ دوں وہ بات جو میرے دل میں مضمر ہے کہ یہ کتاب نہیں ہے' اسے کتاب نہ سمجھئے بلکہ یہ کچھ اور شے ہے۔ لیکن "کتاب" تو خود قرآن اپنے آپ کو کہتا ہے۔ ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کس اعتبار سے کتاب ہے اور کس اعتبار سے کتاب نہیں ہے۔ اس اہم نکتے کو میں بعد میں واضح کروں گا۔ اس مقام پر جو بات بتانی مقصود ہے' وہ بقول اقبال یہ ہے کہ۔

مثلِ حق پنہاں وہم پیداست او
زندہ و پائندہ و گویاست او

چونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اس لئے اس میں وہ ساری شانیں موجود ہیں' جو ذاتِ باری تعالیٰ میں موجود ہیں۔ سورۂ حدید میں آتا ہے کہ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ گویا یہ آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات ظاہر بھی ہے اور باطن یعنی مخفی بھی ہے' اسی طرح قرآن ظاہر بھی ہے اور چھپا ہوا بھی ہے۔ اور جیسے اللہ کی شان ہے "الحَیُّ القَیُّوم" ایسے ہی یہ قرآن بھی زندہ و پائندہ ہے۔

اس اعتبار سے ایک اور نکتہ جو قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے وہ سورۂ اعراف میں بیان ہونے والے واقعہ میں ہے۔ پھر قرآن مجید کے حوالے سے وہی بات سورۂ حشر میں بھی بیان ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف میں بیان ہونے والے جس واقعے کا ذکر میں نے کیا ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے جبکہ انہیں تورات دی جانی تھی۔ حضرت موسیٰ پہلی دفعہ کوہ طور پر اس وقت گئے تھے جب انہیں نبوت سے سرفراز کیا جانا تھا

جب آپؑ مدین سے واپس جا رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد جب ہجرت ہوئی اور آپ تمام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو اب کوہ طور پر دوبارہ طلب فرمائے گئے۔ اب وہاں انہیں تورات دی جانی تھی۔ جب حضرت موسیٰؑ مکالمہ و مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے تو ان کے دل میں ایک شوق بھڑکا کہ یہ پردے کے پیچھے سے گفتگو ہو رہی ہے یعنی "مِنْ وَرَاءِ حِجَاب" تو کیوں نہ دیدارِ الٰہی مجھے حاصل ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں آتا ہے کہ آپؑ نے عرض کیا: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ﴾ اے اللہ جب مخاطبہ و مکالمہ ہو رہا ہے' تو ذرا دیدار بھی ہو جائے! اے میرے رب میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں!! اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔" اب حضرت موسیٰؑ کے لئے اس بات کو مزید واضح کرنے کے لئے ایک تجربہ کرایا گیا۔ وہ تجربہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اپنی ایک تجلی اس پہاڑ پر ڈالیں گے' تم ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو' اگر وہ پہاڑ ہماری تجلی کو برداشت کر جائے تو تم سمجھنا کہ تم بھی ہماری تجلی کو برداشت کر جاؤ گے۔ چنانچہ الفاظ آتے ہیں کہ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا﴾ یعنی جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ دب گیا اور پھٹ گیا' اور حضرت موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آپ غور کریں کہ حضرت موسیٰؑ کو بالواسطہ مشاہدہ ہو رہا ہے' براہ راست تجلی حضرت موسیٰؑ پر نازل نہیں ہوئی ہے بلکہ تجلی پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور اسے صرف دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا اثر اس قدر شدید تھا۔ گویا کہ ذات باری تعالیٰ کی تجلی کا تحمل کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ قرآن کے بارے میں یہی بات ایک تشبیہ کے طور پر سورۂ حشر میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ' وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾ یعنی اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا۔ یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تدبر کریں' غور و فکر کریں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تجلیٔ ذاتِ رب اور قرآن مجید کے مابین تاثیر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ عظمتِ قرآن کا یہ پہلو بھی آپ کے سامنے آجائے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

اللہ کی صفتِ کلام قدیم ہے : اب اس کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ کا کلام قدیم ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ع ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم!۔ اللہ کی تمام صفات قدیم ہیں۔ اس کی ہر صفت اس کی ذات کے ساتھ ہمیشہ سے قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام حروف و اصوات سے مبرا اور ارفع ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک صفتِ قدیمہ کو ہمارے استفادے اور فائدے کے لئے حروف و اصوات کا جامہ پہنا کر نازل کیا ہے' تا کہ ہم اس کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے اس کے بارے میں الفاظ آتے ہیں کہ ﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾ یعنی ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر اتارا ہے تا کہ تم اسے سمجھ سکو۔ (سورۂ زخرف' آیت نمبر ۳)

اصل قرآن کیا ہے؟ : تیسری بات یہ سمجھ لیجئے کہ جو اصل قرآن ہے اس کے بارے میں قرآن حکیم میں تین تعبیرات آئی ہیں۔ پہلی تعبیر "لوح محفوظ"۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ یعنی یہ تو لوح محفوظ میں ہے۔ گویا اصل قرآن وہاں ہے۔ دوسری تعبیر "کتاب مکنون" ہے۔ چنانچہ سورۂ واقعہ میں آتا ہے کہ ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ﴾ یعنی یہ تو چھپی ہوئی کتاب کے اندر ہے۔ گویا یہ کتاب جو ہمارے سامنے مصحف کی شکل میں موجود ہے' جسے ہم چھو رہے ہیں' دیکھ رہے ہیں' پڑھ رہے ہیں' یہ قرآن نہیں ہے' اسے مصحف کہتے ہیں۔ قرآن تو "لوحِ محفوظ" میں ہے۔ قرآن تو "کتاب مکنون" میں ہے۔ اس کی جو تیسری تعبیر کی گئی وہ سورۂ زخرف میں ان الفاظ میں آتی ہے کہ ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ یعنی یہ قرآن تو اس "امّ الکتٰب" میں ہے جو ہمارے پاس ہے۔ اور یہ "علیٌّ حکیم" ہے یعنی بلند و بالا ہے' حکمت والا ہے۔ اصل قرآن وہاں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو ہمارے پاس مصحف ہے اس میں کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اس قرآن کی مصدقہ نقول ہیں' جیسے کہ ہائی کورٹ کا فیصلہ محفوظ ہوتا ہے' اس کی نقلیں آپ جا کے حاصل کرتے ہیں۔

کتاب کسے کہتے ہیں؟ : اب ہم "کتاب" پر بحث کریں گے کہ اس کے کیا معنی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ کتاب کے لفظ کا صحیح صحیح اطلاق تورات پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی شکل میں حضرت موسیٰؑ کو ملی تھی۔ وہ الواح لکھی ہوئی کتاب تھیں۔ کتاب کے معنی "لکھنا" کے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن مجید بھی کتاب ہے' اس لئے کہ بعد میں اس کو لکھ بھی لیا گیا ہے۔ اصلاً یہ لکھی ہوئی شکل میں حضرت محمد ﷺ پر نازل نہیں ہوا۔ اسی اعتبار سے تورات کتاب استثناء' باب ۱۸ کی آیات ۱۸۔۱۹ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کر کے فرمایا کہ "میں ان کے لئے ان کے بھائیوں ہی میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہی وہ منہ سے کہے گا"۔ یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بشارت ہے۔ گویا کہ اللہ کا کلام محمد ﷺ کے منہ میں ڈالا گیا ہے۔ لوگوں تک وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے پہنچ رہا ہے۔ اس اعتبار سے تورات میں اور قرآن میں یہ بڑا بنیادی فرق ہے۔ درحقیقت تورات کے اوپر لفظِ کتاب کا اطلاق اس کی اصل کے اعتبار سے صد فی صد ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کلامُ اللہ ہے اور بعد میں اسے لکھا بھی گیا ہے۔ اب مصحف کی شکل میں بھی ہمارے پاس موجود ہے' لیکن اصلاً یہ اللہ کا کلام ہے۔ اسی لئے اس قرآن کے لئے آپ نے دیکھا ہو گا قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ﴾ یعنی اللہ کا جو کلام محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے منہ میں ڈالا گیا' وہاں سے اب وہ قولِ رسولِ کریمؐ کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔ "رسول کریم" کے الفاظ حضرت جبرائیل اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دونوں کے لئے ہیں۔

کلامِ الٰہی کی شکلیں : کلام الٰہی کی تین شکلیں ہیں کہ جن کا ذکر سورۂ شوریٰ کے آخری حصے کی آیات میں آیا ہے۔ فرمایا گیا کہ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے سوائے تین میں سے ایک صورت کے۔ یا تو بذریعہ وحی' اور وحی سے مراد یہاں براہ راست وحی ہے' وہ چیز

جسے ہم "الہام" کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی بات ڈالے۔ یہی "الہام" جب نبی کو دیا جاتا ہے تو اسی کا نام "وحی" ہوتا ہے۔ یا دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ باہم گفتگو ہوتی ہے لیکن یہ گفتگو "مِن وَرَاءِ حِجَاب" اوٹ یا پردے کے پیچھے سے ہوتی ہے' جیسے کہ حضرت موسیٰ سے کوہ طور پر ہوئی اور یہی گفتگو محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے معراج کے موقع پر ہوئی۔ "اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ" کے الفاظ حضور ﷺ نے ادا فرمائے اور "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" کے الفاظ اللہ کی طرف سے آئے۔ اس کے جواب میں پھر حضور ﷺ نے فرمایا: "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ"۔ یہ معراج کا مکالمہ ہے جو ہم تشہد میں دہراتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کیا گفتگو ہوئی ہے' ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اب تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے کو بھیجتا ہے' جو وحی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک وحی بواسطہ فرشتہ جبکہ وحی کی دوسری قسم براہ راست ہوتی ہے۔ اس میں فرشتے کی درمیانی کڑی موجود نہیں ہوتی۔

وحی کی اقسام: اب یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید صرف تیسری قسم کے کلام پر مشتمل ہے۔ حضور ﷺ کے دل میں اللہ تعالیٰ جو کچھ ڈالتا رہتا تھا وہ "وحی خفی" ہے اور وہ قرآن میں نہیں ہے' حدیث میں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بعض احادیث جنہیں ہم کہتے ہیں کہ یہ "حدیثِ قدسی" ہیں جن میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ یوں فرماتا ہے' گویا وہ بھی کلام تو اللہ ہی کا ہے لیکن ہمارے پاس وہ ذخیرۂ احادیثِ نبویہ میں ہیں' قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طریقے سے یہ جو حضورؐ کا شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ سے مکالمہ ہوا ہے وہ قرآن میں نہیں ہے۔ گویا یہ بات ثابت ہو گئی کہ قرآن صرف تیسری قسم کی وحی پر مشتمل ہے جسے قرآن ﴿اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ﴾ کے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اسی لئے فرمایا ﴿نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ﴾ یعنی قرآن روح الامین (جبرائیلؑ) کے ذریعے سے نازل ہوا ہے آپ کے قلب پر۔ یہ چند باتیں اس وضاحت میں عرض کی گئی ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

(ii) قرآن حکیم کا محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول

دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ یہ کلام محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ اب نزولِ قرآن کے بارے میں بھی دو باتیں جان لیجئے۔ "نَزَل - یَنزِل" یہ ثلاثی مجرد ہے' یعنی کسی شے کا اترنا۔ ایک ہے "اَنزَلَ - یُنزِلُ" اتارنا۔ یہ "باب افعال" ہے۔ ایک ہے "نَزَّلَ - یُنَزِّلُ" یہ بھی اتارنا ہے۔ یہ باب تفعیل ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے لئے لفظ "نَزَلَ" بھی آیا ہے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِينُ﴾ لیکن "با" کے اضافے کی وجہ سے اس کے معنی اتارنا ہو گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ترجمہ ہو گا کہ "اسے اتارا ہے روح الامین نے" یا "اسے لے کر اترا ہے روح الامین" یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام۔ لیکن اصل میں اس کے لئے جو صیغے استعمال ہوتے ہیں وہ ہیں "اَنزَلَ - یُنزِلُ - اِنزَالاً" باب افعال سے اور "نَزَّلَ - یُنَزِّلُ - تَنزِیلاً" باب تفعیل سے۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

باب افعال کا خاصہ یہ ہے کہ کوئی کام دفعتاً ہو جائے' جبکہ باب تفعیل کا خاصہ یہ ہے کہ کوئی کام درجہ بدرجہ' ٹھہر ٹھہر کر' تھوڑا تھوڑا ہو کر' بڑے اہتمام کے ساتھ کچھ مدت میں مکمل ہو۔ مثلاً اعلام کے معنی کسی کو کچھ بتا دینا ہیں جبکہ تعلیم کے معنی ہیں کچھ سکھانا۔ اگر آپ نے کسی کو ایک دم کوئی بات بتا دی تو اب ضروری نہیں کہ اس کی سمجھ میں بھی آ گئی ہو۔ لہٰذا درجہ بدرجہ بات سمجھائیے' ذہن نشین کرائیے' پھر دیکھئے کتنی بات سمجھ میں آ گئی ہے' امتحان لیجئے' پھر اس کے بعد اس کو مزید سمجھائیے۔ اس عمل کا نام تعلیم ہے۔ اب آپ سمجھ لیجئے کہ جو "اعلام" اور "تعلیم" کا فرق ہے وہی "اِنزال" اور "تنزیل" کا بھی ہے۔ اب قرآن مجید میں جہاں رمضان المبارک میں یا لیلۃ القدر میں اتارنے کا بیان ہوتا ہے تو "انزال" کا لفظ آتا ہے۔ چنانچہ الفاظ آتے ہیں کہ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي اُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ﴾ اور ﴿اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾۔ اس کے معنی کیا ہوئے؟ رمضانِ مبارک میں جو وہ لیلۂ مبارکہ ہے یعنی "لیلۃ القدر" اس میں یہ پورا قرآن دفعتاً "جُملۃً واحدۃً" لوحِ محفوظ سے اتار کر پہلے آسمان پر پہنچا دیا گیا۔ اب وہاں سے

درجہ بدرجہ تھوڑا تھوڑا کرکے بائیس برس میں جاکر اس کی "تنزیل" مکمل ہوئی۔ تو حضورؐ پر اتارے جانے کے لئے "نَزَّلَ" کا لفظ آیا ہے۔ یہ اتارنا ہے تھوڑا تھوڑا کرکے۔ ﴿نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ یعنی ہم نے اسے اتارا ہے آپؐ پر بطریق تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے۔ یہ درحقیقت دونوں الفاظ کا فرق ہے۔ لوح محفوظ سے سماءِ دنیا تک یعنی سب سے نچلے آسمان تک "انزال" ہے۔ اس لئے کہ یہ دفعتاً ہوا' جملۃً واحدۃً ہوا۔ وہاں سے حضرت جبرئیلؑ وقت کے مطابق' ضرورت کے مطابق محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل فرماتے رہے۔ اس کے لئے صیغہ تنزیل کا آتا ہے۔

قرآن کا زمانہ نزول : اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن کا زمانہ نزول کیا ہے۔ ہم جس حوالے سے تاریخ کو کچھ یاد رکھتے ہیں وہ سنِ عیسوی ہے۔ اس کے اعتبار سے ۶۱۰ عیسوی میں یہ تنزیل محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر شروع ہوئی اور ۶۳۲ء میں حضورؐ کا انتقال ہوگیا۔ اس لحاظ سے ۲۲ برس شمسی بنتے ہیں۔ ۶۱۰ عیسوی سے ۶۳۲ء کے دوران بائیس (۲۲) برس میں قرآن نازل ہوا۔ سن ہجری کے حساب سے کہیں گے تو عام الفیل کے حساب سے وہاں پر کیلنڈر شروع ہوگیا تھا۔ چالیس عام الفیل میں اس کا نزول شروع ہوا ہے۔ اس لئے کہ عام الفیل ہی میں حضورؐ کی پیدائش ہوئی ہے۔ اصحابِ فیل کا واقعہ بہت مشہور ہے جس میں ابرہہ ہاتھیوں کے ساتھ فوج لے کر کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا' عربوں نے وہاں سے اپنا کیلنڈر شروع کیا ہے۔ گویا قرآن کے نزول کا آغاز چالیس عام الفیل میں ہوا ہے۔ ہجرت کے حساب سے اسے بارہ قبلِ ہجرت کہیں گے۔ ہجرت سے بارہ سال پہلے اس کا آغاز ہوا اور سن گیارہ ہجری میں اس کی تکمیل ہوگئی۔ قمری حساب سے یہ تقریباً تیئیس (۲۳) برس بنتے ہیں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔

قرآن کا مقام نزول : اس کے ساتھ ہی دوسری عام دلچسپی کی چیز یہ ہے کہ قرآن نازل کہاں ہوا۔ اب اگر آپ کہیں گے عرب میں' تو عرب بہت بڑی جگہ ہے جس میں پورا جزیرہ نمائے عرب شامل ہے۔ یہ بہت بڑا ملک ہے۔ عرب کا ایک علاقہ جس کا نام حجاز ہے' پورا قرآن یہاں پر نازل ہوا ہے۔ حجاز ہی کے یہ شہر ہیں' مکہ بھی' طائف بھی' اسی میں

یہ سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ.....﴾ اور وہ آخری آیت جس میں قرآن مجید کی طویل ترین دعا ہے : ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا.....﴾ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت موجود ہے کہ یہ دو آیتیں شبِ معراج میں حضور ﷺ کو عطا ہوئی ہیں جبکہ آپ ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ پر تھے' اور امت کے لئے تحفے کے طور پر حضورؐ کو دی گئی ہیں۔

(iii) محفوظیتِ قرآن

قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے کے حوالے سے تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کُل کا کُل محفوظ ہے۔ نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہوئی ہے' نہ تحریف اور نہ ہی تبدیلی ہوئی ہے۔ بقول اقبال۔

حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

اقبال کہتے ہیں کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے کہ جس کے نہ کسی حرف میں کوئی تبدیلی یا ترمیم ہوئی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی شک والی بات ہے۔ اور اس کی آیات درحقیقت تاویل کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ آیات خود اپنی جگہ پر واضح ہیں' "بینات" کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حفاظتِ قرآن اور اہل تشیّع : ہمارے ہاں اہل تشیع کی طرف سے قرآن کے محفوظ ہونے کے ضمن میں بڑے شکوک و شبہات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اہلِ تشیع کا کہنا یہ ہے کہ اصل قرآن تو حضرت علیؓ کے پاس تھا اور وہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے تھا۔ وہ اصل قرآن اب ان کے عقیدے کے مطابق ان کے بارہویں امام جو کہ ابھی روپوش ہیں' یعنی امام غائب ہیں' ان کے پاس ہے۔ وہ جب ظاہر ہوں گے تو وہ اصل قرآن لے کر آئیں گے۔ اگرچہ جب معاملہ عدالتی نوعیت کا ہوتا ہے تو اہل تشیع کا موقف یہ ہوتا ہے کہ ہم بھی اسی قرآن کو مانتے ہیں' یہی اصل قرآن ہے' یہ محفوظ ہے' لیکن آپ ان کی

وادیٔ نخلہ بھی ہے' اسی کا شہر مدینہ بھی ہے۔ اور یہی حجاز ہے جو جا کر اوپر شام کی سرحد سے ملتا ہے۔ گویا تبوک اس کی آخری سرحد ہے۔ حضور ﷺ نے اگرچہ آغازِ وحی سے قبل بڑے بیرونی سفر بھی کئے۔ آپؐ شام بھی جاتے تھے' تجارت کے لئے آپ بڑے ممالک میں گئے ہیں' بلکہ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق حضورؐ سندھ کے ساحل پر بھی تشریف لائے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں پر جو میلے لگتے تھے' تو حضورؐ وحی کے آغاز سے قبل یہاں تشریف لائے تھے۔ تاہم اس کے لئے وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ "الخبر" جہاں پر ہے یعنی مشرقی ساحل پر' یہاں بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا۔ وہاں حضورؐ کی آمد قطعی طور پر ثابت ہے۔ اس حوالے سے میں یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ حضورؐ نے اگرچہ وحی کے آغاز سے قبل بہت دور دراز کے سفر بھی کئے ہیں' لیکن وحی کے آغاز سے لے کر آپؐ کے انتقال تک' آپؐ کا سارا وقت حجاز میں ہی گزرا ہے۔ اسی حجاز ہی کے ایک شہر مکے میں آپؐ تھے تو قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصہ نازل ہو گیا۔ پھر آپ ہجرت کے سفر میں جا رہے تھے تو اس میں کچھ آیات نازل ہو گئیں۔ طائف جا رہے تھے تو اس کے دوران کچھ آیات نازل ہو گئیں۔ پھر جب آپ مدینہ منورہ میں مقیم تھے تو اُس وقت قرآن مجید کی طویل ترین سورتیں نازل ہو گئیں۔ تبوک کے لئے جب تشریف لے جا رہے تھے تب کچھ آیات نازل ہو گئیں۔ اسی طرح مختلف غزوات کے لئے جاتے تھے یا واپس تشریف لاتے تھے تو اس وقت آیات نازل ہوتیں۔ لیکن یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے سمجھ لیجئے کہ یہ جزیرہ نمائے عرب کا صرف ایک حصہ ہے۔ یہ شمالاً جنوباً تو کافی لمبا ہے مگر اس کی چوڑائی کم ہے' کہیں پچاس میل ہے تو کہیں تیس میل ہے۔ یہ اصل میں پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس سے مغرب کی طرف کا علاقہ "تہامہ" کہلاتا ہے اور اس سے مشرق کی طرف نجد کہلاتا ہے۔ نجد میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں فوجی مہمات گئی ہیں لیکن حضورؐ کا جانا ثابت نہیں ہے۔ گویا قرآن حکیم کے لئے ارضِ نزول حجاز ہے اور زمانہ نزول ۶۱۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک ہے۔

البتہ نزول کے اعتبار قرآن کی دو آیتیں مستثنیٰ ہیں۔ یہ دو آیتیں آسمان سے اتر کر زمین پر حضورؐ پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ حضورؐ آسمان پر جا کر ان آیات کو لے کر آئے۔

امہاتُ الکتب پڑھ کر دیکھئے تو وہاں آپ کو یہ ہفوات بھی مل جائیں گی کہ اتنی آیتیں اس میں سے ختم کر دی گئیں' اتنی سورتیں نکال دی گئیں' اتنا حصہ حضرت علیؓ کی مدح میں تھا' وہ وہاں سے نکال دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ البتہ ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن کی ترتیبِ نزولی اور تھی' ترتیبِ مصحف کچھ اور ہے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں ہے اور اس بات کو ہم بھی مانتے ہیں۔ چنانچہ اس کے حوالے سے بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اس حوالے سے چند مزید باتیں میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

قرآن مجید کی زبان اور اسلوب

اب میں اس بات کی طرف آتا ہوں کہ قرآن مجید کی زبان کونسی ہے۔ اگر آپ کہیں عربی زبان ہے تو عربی زبان کی تو بے شمار صورتیں ہیں۔ عرب کے جزیرہ نما میں عربی زبان کے اتنے لہجے (dialect) تھے کہ ایک دوسرے کی عربی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ چنانچہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں ایک وفد آیا تھا اور وہ لوگ آکر جب حضورؐ سے گفتگو کر رہے تھے تو صحابہ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہر زبان میں کئی ایک لہجے ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ پنجابی ایک زبان ہے لیکن پنجابی کے نامعلوم کتنے "dialect" ہیں۔ اسی طرح عربی کے بھی بے شمار لہجے تھے۔ آج کی عربی میں بھی مختلف علاقوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ آپ لیبیا کی عربی جا کر سنئے' اسے حجازی نہیں سمجھے گا کہ یہ کیا بول رہے ہیں۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا عربی زبان پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اُس دور کی عربی کو محفوظ کر دیا ہے' ورنہ ایک دو صدیاں گزرنے پر ہی کسی زبان میں بہت سا تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ جبکہ آج بھی فصیح عربی ایک ہی ہے کہ جس میں تصنیف و تحریر کا کام کیا جاتا ہے اور یہ قرآن حکیم کی زبان ہے۔ عالم عرب میں آپ کو فصیح زبان بولنے والے بھی ملیں گے جنہیں فصحاء کہتے ہیں لیکن مقامی زبان تو ہر علاقے کی اپنی ہے۔ یہ معاملہ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی تھا۔ اُس وقت بھی بہت سے لہجے تھے۔ اگرچہ قرآن مجید سورۂ زخرف کے آغاز میں کہتا ہے کہ ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا

جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ سورۂ یوسف میں فرمایا : ﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ اسی طرح سورۂ زمر میں فرمایا : ﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ یہ الفاظ مختلف آیات میں آئے ہیں۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربی کون سی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حجاز کی عربی۔ پھر یہ کہ حجاز کے بھی شہروں کی عربی نہیں بلکہ حجاز کے دیہات کی۔ حجاز کی بدوی زبان اصل زبان تھی۔ عربوں میں بھی اصل عربی اسے ہی مانا جاتا تھا۔ اس لئے کہ شہروں میں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے ہیں تو زبان گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عرب اپنی زبان کو خالص رکھنے کا بڑا اہتمام کرتے تھے کہ ہمارے بچوں کی زبان خراب نہ ہو جائے۔ اب ظاہر بات ہے کہ مکے میں وفد چلے آ رہے ہیں' تجارتی قافلے چلے آ رہے ہیں' شامی چلے آ رہے ہیں' یمنی چلے آ رہے ہیں' حبشی چلے آ رہے ہیں' تو ظاہر ہے کہ وہاں کی زبان تو بگڑے گی۔ اس لئے عرب اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی دور دراز صحرائی دیہاتوں میں بھیج دیتے تھے' اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا اصل کلچر اور تہذیب وہاں ہے۔ اس حوالے سے آپ یوں سمجھئے کہ یہ حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان ہے کہ جو قرآن مجید نے اختیار کی ہے۔ مدینے میں بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہود آکر آباد ہو گئے۔ مدینے میں جو دو قبیلے اوس اور خزرج تھے' یہ بھی یمن سے آئے تھے۔ اس اعتبار سے ان کی زبانوں اور لہجوں میں باریک باریک فرق تھا۔ لہٰذا "لِسَانٌ عَرَبِيٌّ" سے مراد حجاز کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے۔

البتہ دوسرے مختلف قبائل کے جو لہجے تھے تو قرآن مجید میں کوئی کوئی لفظ ان کا بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ غیر زبان کے بھی قرآن نے لے لئے ہیں۔ وہ الفاظ معرب ہو کر آئے ہیں' جیسے "سِجِّيْل" کا لفظ ہے۔ یہ دراصل "سنگِ گِل" ہے اور یہ فارسی کا لفظ ہے اور فارسی ہی کی ترکیب ہے' یعنی یہ کہ جو مٹی کا بنا ہوا پتھر ہوتا ہے۔ صحراؤں میں اس طرح ہوتا ہے کہ اگر بڑی ہلکی سی بوندا باندی ہوئی' ایک ایک قطرہ تھا' تھوڑی سی مٹی کے ساتھ مل کر گارا بن گیا' اب وہ چھوٹی سی گولی بن گئی۔ پھر جب تیز دھوپ پڑی تو گویا کہ اسے بھٹی میں تپا دیا گیا۔ اب کنکر بن گیا۔ کنکر جو ہوتے تھے' درحقیقت یہ اس مٹی کے

بنے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی جو گولیاں تھیں کہ جو سورج کی تپش کی وجہ سے پک کر پختہ ہو جاتی تھیں۔ یہ "سنگِ گِل" تھیں جنہیں قرآن مجید نے "سِجِّیل" کہا ہے۔

فصاحت و بلاغت کی معراج : جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی معراج ہے تو اس کو بڑے بڑے فصحاءِ عرب نے مانا ہے۔ بڑے بڑے شعراء موجود تھے لیکن سب نے تسلیم کیا کہ یہ زبان ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔ یہ گویا کہ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے۔

کیا قرآن میں موسیقی ہے؟ : قرآن کی زبان کے حوالے سے ایک اور بات یہ سمجھ لیجئے کہ یہ ایک موسیقی بھی ہے۔ یہ ایک "Divine Music" ہے' ایک ملکوتی غناء ہے۔ اس کے اندر ایک ردھم ہے' ایک موسیقی ہے اور اس موسیقی کی اپنی تاثیر ہے۔ میں اس چیز کو مانتا ہوں۔ مجھے چونکہ ذاتی تجربہ بھی ہوا ہے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ غالباً ساٹھ کی دہائی کا بھی ابتدائی زمانہ تھا۔ مجھے قرآن حکیم کی دو سورتوں سے' معاذاللہ' انقباض سا ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک سورۂ رحمٰن ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اس میں کیا حور و قصور اور غلمان کا تذکرہ ہو رہا ہے' کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ ایک شخص جو نفسیاتی اور شعوری اعتبار سے بلند ہو جائے تو اس کے سامنے ان چیزوں کی لذتیں نہیں رہا کرتیں۔ تو کیا قرآن مجید ان چیزوں کا ذکر کرتا ہے؟ یہی معاملہ سورۂ واقعہ کا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے قاری محمد خلیل الحصریؒ کی پڑھی ہوئی سورۂ واقعہ اور سورۂ رحمٰن کی تلاوت سنی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی حجاب سا تھا جو اب اترتا جا رہا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ان کے معانی تو پہلے بھی مجھے معلوم تھے' قراءت میں معانی تو بدل نہیں گئے تھے' لیکن ان کے پڑھنے کے انداز کا یہ اثر تھا۔ اب اس کا کوئی تعلق عقل و شعور اور دلیل سے نہیں ہے۔ یہ درحقیقت قرآن کے ملکوتی غناء کی عکاسی ہے۔

یہ بات بھی آپ جان لیجئے کہ قرآن کی ادبیت اور فصاحت و بلاغت کا معاملہ صرف عقیدے کا نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے عرب عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی ہیں۔ یہ جو

عیسائی عرب ہیں' اور قرآن پر جن کا ایمان اس اعتبار سے نہیں ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے' وہ محمد ﷺ کو اللہ کے نبی اور رسول نہیں مانتے' لیکن وہ بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ عربی ادب کا مقامِ عروج (climax) قرآن ہے۔ یہ اس کی زبان کے بارے میں چند باتیں تھیں۔

قرآن کے اسماء و صفات : علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی معرکہ الاراء کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں قرآن کے پچپن (۵۵) نام شمار کئے ہیں' جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ابھی لسٹ مکمل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے جو اہم اسماء ہیں جو ہمیں معلوم ہیں وہ "القرآن" "الکتاب" "الذکر" "الھدیٰ" "النور" "الفرقان" "کلام اللہ" اور "الوحی" ہیں۔ چند نام اور بھی ہیں جو قرآن کی صفات ہیں۔ جیسے "الکریم" "الحکیم" "العظیم" "المجید"۔ کہیں پر آ جائے گا کہ "کِتَابٌ کَرِیْمٌ" جیسے کہ قرآن مجید میں سورۂ واقعہ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: "اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ○ فِیْ کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ ○" تو یہ اس کے مختلف اسماء و صفات ہیں۔

لفظ "قرآن" کے معانی : اس میں سب سے زیادہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ قرآن کے معنی کیا ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کا جو سب سے زیادہ مشہور نام ہے اور جسے ایک طرح سے اسم علم کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے وہ قرآن ہے۔ اور اس کا معاملہ بالکل وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ مشہور نام "اللہ" کا ہے جسے بہت سے لوگ اسم ذات کہتے ہیں۔ جیسے لفظ "اللہ" کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ یہ کس مادے اور کس مصدر سے ہے اسی طرح سے قرآن کے بارے میں بھی یہ طے نہیں ہو پا رہا کہ اس کا اصل مصدر و مادہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ اسم جامد ہے' لہٰذا اس کے اندر کوئی معنی تلاش کرنا غلط ہے۔ جیسے "لاہور" اسم جامد ہے' جو ایک خاص جگہ کے لئے بطور اسم علم استعمال ہوتا ہے۔ اب لفظ "لاہور" کے معنی تلاش کرنا عبث ہے۔ قرآن کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ یہ "قرن" سے بنا ہے۔ "قرن" کہتے ہیں کسی شے کا قریب آنا۔

دو نہایت سعید اور خوش بخت چیزیں قریب آجائیں تو اس کو "قران السعدین" کہتے ہیں۔ اسی طریقے سے "قرَن الشیءُ بالشیءِ" کوئی شے کسی شے کے ساتھ جڑ گئی' آکر مل گئی۔ تو یہ "قرن" کا مادہ ہو گیا۔ اسی سے "قرینہ" اور "قرائن" کے الفاظ بھی آئے ہیں' جن کا استعمال اس طرح ہوتا ہے کہ قرائن یہ بتا رہے ہیں' یعنی آس پاس کی چیزوں سے یہ اندازہ ہو رہا ہے۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ یہ "قرء" سے بنا ہے۔ اور "قرء" کے عربی زبان میں دو معنی آتے ہیں۔ ایک تو وہ معنی ہے کہ جس کو ہم جانتے ہیں یعنی پڑھنا۔ تو گویا کہ جیسے کہ رجحان اور غفران مصدر ہیں لیکن وہ مفعول کے معنی دیتے ہیں' اسی طریقے سے "قرء" سے قرآن بنا ہے' یعنی پڑھی جانے والی شے' اور "قرء" کے دوسرے معنی کسی شے کے جمع کر دینے کے ہیں۔ جیسے "قریۃ" کہتے ہیں کسی گاؤں کو' جہاں لوگ جمع ہو کر رہتے ہیں۔ لوگوں کو جمع کرنے والی جگہ "قریۃ" ہے۔ تو اسی اعتبار سے جب "قرآن" کو جمع کر دیا گیا ہے تو اس نے گویا کہ "قرآن" کی شکل اختیار کر لی۔ لہٰذا اس کے دونوں معنی ہو گئے' پڑھی جانے والی شے اور جمع شدہ شے۔ کیونکہ قرآن مجید کی آیات تو نازل ہوئی ہیں بائیس یا تیئیس سال میں' مختلف اوقات میں۔ پھر ان کو جمع کیا گیا' ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور اس طرح سے قرآن وجود میں آیا۔ تو "قرء" سے لیا جائے تب بھی اور "قرن" سے لیا جائے تب بھی' یا تو اس کے معنی ہوں گے پڑھی جانے والی شے' قرآن' یا اس کے معنی ہوں گے جمع شدہ شے۔ غالب نے کہا ہے۔

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

تو جیسے جگر لخت لخت جمع ہوتا ہے اسی طریقے سے ان آیات کو لا کر' جوڑ کر جمع کر دیا گیا ہے۔ تو اس معنی میں اسے قرآن کہا جاتا ہے۔

اسلوب کلام : اب چند باتیں اسلوب قرآن کے حوالے سے سمجھ لیجئے۔ پہلی بات نوٹ کر لیجئے جس کو قرآن بڑی سختی کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ شعر و شاعری نہیں ہے۔ اس کی نفی تو بہت ہی شدت سے ہوئی ہے۔ سورۂ یٰسین میں آتا ہے کہ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا

یَنْبَغِیْ لَہٗ ﴾ یعنی ہم نے نہ اپنے پیغمبر کو شاعری سکھلائی ہے اور نہ یہ ان کے شایانِ شان ہے۔ پھر یہ کہ شعراء کی بحیثیتِ مجموعی مذمت بھی آئی ہے چنانچہ سورۂ شعراء میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿ وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوُوْنَ ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ ○ وَاَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ ○ ﴾ ان آیات میں واقعہ یہ ہے کہ شعراء کے لئے تو پسینے سے پانی پانی ہو جانے والا مقام ہے۔ شعراء کے بارے میں فرمایا کہ ان کا اتباع کرتے ہیں "غاوُون" یعنی جو پیچھے پڑے رہتے ہیں' وہ لوگ کہ جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ پھر یہ شعراء ہر وادی کے اندر سیر کرتے ہیں۔ ابھی کوئی بہت اعلیٰ بات کہہ رہے ہیں اور پھر شراب و کباب کی بات شروع کر دی۔ جدھر رخ ہو جدھر چاہیں گے نکل جائیں گے' کوئی متعین راستہ ہے ہی نہیں۔ کہاں بڑی عارفانہ باتیں ہو رہی تھیں اور کہاں شراب و کباب کے قصے! تیسری بات شعراء کے بارے میں یہ کہی کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ اس لئے کہ شعر میں تاثیر ہوتی ہے مبالغہ سے' مبالغہ نہ ہو تو شعر کے اندر کیا رہ گیا۔ وہ تو پھر نیچرل شاعری رہ جائے گی۔ کہاں مولانا حالؔی کی نیچرل شاعری اور کہاں میرؔ اور غالبؔ کی شاعری' ان میں تو زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ اس حوالے سے اصل شاعری تو وہ شمار ہو گی جس میں مبالغہ ہے۔ اور اس مبالغے پر خود پورا اترنا بڑا مشکل کام ہے۔ مثلاً اقبالؔ کے اسی شعر کو لیجئے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اب اس معیار پر پورا اترنا کوئی آسان کام ہے؟ لہٰذا شعر میں عموماً یہی کچھ ہوتا ہے' الا ماشاء اللہ۔ اس آیت میں آگے "اِلّا" بھی آیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائیں' عمل صالح کریں۔ تو قرآن نے شعراء کو کچھ نہ کچھ پناہ بھی دے دی ہے' جیسے علامہ اقبال ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی تو یہی کہا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا "وَمَا عَلَّمْنٰہُ الشِّعْرَ" ہم نے انہیں شعر سکھایا ہی نہیں اور "وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ" یہ ان کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا کوئی گھٹیا بات ہے جو حضورؐ کے شایان شان نہیں ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کو شعر سے مناسبت ہی نہیں تھی۔ یہاں

تک کہ آپؐ کوئی شعر پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تو اس میں غلطی ہو جاتی۔ اس لئے کہ شعر میں ردھم اور قوافی اور وزن کا خیال رکھنا پڑتا ہے جبکہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے وہ شے ہی نہیں دی۔ چنانچہ واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے ایک موقع پر ایک شعر پڑھا' حضرت ابوبکرؓ موجود تھے' وہ مسکرانے لگے اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی عرض کیا "اِنّی اشھَدُ اَنّکَ لرَسُولُ اللّٰہ" میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں' اس لئے کہ آپؐ نے شعر غلط پڑھا ہے' اس لئے میں گواہی دے رہا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ کے ذہن میں قرآن کا یہ ارشاد موجود تھا کہ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ ہم نے ان کو شعر سکھایا ہی نہیں اور یہ ان کے شایان شان بھی نہیں ہے۔

بہرحال پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ قرآن بڑی شدت سے گواہی دیتا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ البتہ ایک بات نوٹ کر لیجئے اور وہ یہ ہے کہ آج کل شاعری کی ایک نئی قسم وجود میں آئی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ شاعری قرآن مجید سے مستعار لی گئی ہے' اور وہ ہے "آزاد شاعری"۔ اس میں ایک ردھم ہوتا ہے' وزن نہیں ہوتا' قوافی نہیں ہوتے' ردیف نہیں ہوتے۔ اس ردھم کے اعتبار سے ہم اسے شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن مجید سے قریب تر اگر آ سکتی ہے تو وہ آزاد شاعری ہے۔ میں یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ آزاد شاعری کا آغاز کب سے ہوا کیونکہ میں ادب کا طالب علم کبھی نہیں رہا ہوں۔ وہ شاعری جسے ہم جانتے ہیں' اس کے شعر' اس کے اوزان اور اس کی بحریں' یہ بڑے ہی ٹیکنیکل ایشوز ہیں۔ بہرحال آپ کے علم میں ہے کہ یورپ میں زیادہ رواج آزاد شاعری کا ہی ہے۔ وہاں اس کا رواج کب سے ہے' یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ یورپ میں آزاد شاعری میں بھی قافیہ و ردیف کا کچھ نہ کچھ خیال رکھا جاتا ہے' چنانچہ ورڈزورتھ وغیرہ کی شاعری سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ردیف و قافیہ کا کچھ نہ کچھ خیال رکھتے ہیں۔ اس شاعری کے حوالے سے ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ وہ شاعری جو عرب جانتے تھے اور وہ شاعری جس سے کہ ہم عام طور پر متعارف ہیں' قرآن اس اسلوب پر نہیں ہے۔ البتہ آزاد شاعری ہمیں قرآن سے کسی درجے میں مناسبت رکھنے والی اور کوئی مطابقت رکھنے والی شے معلوم ہوتی ہے۔

قرآن عام معنی میں کتاب نہیں ہے : اس بات پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے کہ "کتاب" کے لفظ کا بتمام و کمال اطلاق تورات پر ہوتا ہے قرآن پر نہیں ہوتا۔ اب ہم کتاب کے عام معانی کے حوالے سے چند باتیں سمجھیں گے۔ قرآن حکیم کو ہم عام معانی میں کتاب نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ کتاب کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ کتاب کے ابواب ہوں گے' ہر باب میں ایک مضمون مکمل ہو جائے گا۔ اگلے باب میں آپ اسے نہیں دہرائیں گے۔ اگر دہرائیں گے تو وہ کتاب کا عیب شمار ہو گا۔ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ قصۂ آدم و ابلیس سات سورتوں' سورۂ بقرہ' سورۂ اعراف' سورۂ حجر' سورۂ بنی اسرائیل' سورۂ کہف' سورۂ طٰہٰ اور سورۂ ص میں بیان ہوا ہے۔ گویا اتنی سورتوں میں آدم و ابلیس کا واقعہ چل رہا ہے۔ ایک عام کتاب کے اعتبار سے تو یہ نقص شمار ہو گا۔ لہٰذا اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ مجموعہ مقالات بھی نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب نہیں ہے' مقالات کا مجموعہ بھی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ میں نے نفی تو کافی چیزوں میں کر دی ہے' اثبات کس چیز میں ہے؟ اصل میں عربوں کے ہاں ادب کے میدان میں دو اصناف بہت معروف تھیں' ایک شعر اور دوسرے خطبہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب خطیب بلا کے ہوتے تھے۔ قرآن حکیم کا اسلوب خطبے کا ہے۔ امام جلال الدین سیوطی نے جاحظ کا ایک قول نقل کیا ہے' جو خود شاعر و ادیب تھے کہ قرآن کریم کو ہم دیوان کہہ سکتے ہیں' ہر سورۃ گویا ایک قصیدہ ہے' ہر آیت گویا ایک بیت یا شعر ہے' جو اشعار میں قوافی ہوتے ہیں وہ آیات کے فواصل ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت ایک بے تکی بات ہے۔ قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ چنانچہ خطبے کے چند اوصاف یہاں بیان کئے جائیں گے۔ خطیب اور اس کے مخاطبین کے درمیان ایک بصری رابطہ ہوتا ہے۔ خطیب ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر رہا ہوتا ہے کہ اس کی ایک تاثیر ہوتی ہے۔ اس کے حوالے سے ہمیشہ یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآن مجید کی کس سورت میں کن سے خطاب ہو رہا ہے۔ جب تک آپ مخاطب معلوم نہیں کریں گے اس کے اصل مفہوم اور معانی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

خطبے میں دوسری خوبی یہ ہوتی ہے کہ خطیب کے مخاطبین بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ آپ سے بات کرے گا لیکن غائب کے صیغہ میں کرے گا' کبھی غائب کو حاضر کے صیغہ میں مخاطب کرے گا۔ مثلاً بھٹو صاحب کا دور ہے' خطیب بھٹو صاحب سے ایسے مخاطب ہو رہا ہے جیسے وہ سامنے موجود ہوں لیکن وہاں نہ صدر ایوب صاحب ہیں نہ بھٹو صاحب موجود ہیں۔ البتہ گفتگو اس انداز میں ہوتی ہے کہ گویا وہ یہاں موجود ہیں۔ یعنی کبھی حاضر کو غائب سمجھ کر بات ہوتی اور کبھی غائب کو حاضر سمجھ کر بات ہوتی ہے۔

خطبے میں تیسری بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں خطاب کا رخ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ابھی کوئی بات ہو رہی تھی بے نظیر کو خطاب کر کے' ابھی جو سامعین سامنے موجود ہیں ان سے گفتگو شروع ہو گئی ہے' بیچ میں قاضی حسین احمد صاحب سے بات کر لی۔ یہ خطبے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ یہی انداز آپ کو قرآن میں بھی ملے گا۔ ابھی بات کفار سے ہو رہی تھی' اس کے بعد اہل ایمان سے گفتگو شروع ہو گئی تو بیچ میں کہیں منافقین سے روئے سخن بھی آ گیا۔ اسی طرح کہیں مشرکین کی بات ہو رہی تھی' درمیان میں کہیں اہلِ کتاب کا تذکرہ ہو گیا۔ گویا کہ خطبے میں جو تمام اوصاف ہوتے ہیں وہ سارے کے سارے اوصاف آپ کو قرآن مجید میں ملیں گے۔

خطبے کا ایک چوتھا وصف بھی ہے۔ یہ وصف اگرچہ قصیدے میں بھی ہوتا ہے لیکن خطبے میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ قصیدے اور غزل میں "مقطع" اور "مطلع" کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ پہلا شعر جاندار ہے تو آدمی پوری غزل پڑھے گا' لیکن اگر پہلا شعر ہی پھسپھسا ہے تو اگلا شعر پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کرے گا' لہٰذا مطلع زوردار ہونا چاہئے۔ اسی طرح "مقطع" یعنی جو آخری شعر ہوتا ہے وہ اگر زوردار ہے تو اس سے ایک اچھا اختتامی تاثر (Last Impression) قائم ہو گا' ورنہ نہیں۔ اگر درمیان میں وہ تاثر قائم ہوا بھی تھا تو اب پھسپھسا قسم کا مقطع آ گیا تو سارا تاثر ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح خطیب جب خطبہ شروع کرتا ہے تو اگر آغاز ایسا ہو کہ وہ اپنے سامعین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لے تب تو لوگ اس کی بات پوری توجہ سے سنیں گے' لیکن اگر خطیب کا انداز شروع ہی میں پھسپھسا ہے' تو سامعین کی دلچسپی آغاز سے ہی نہیں رہے گی۔

اسی طریقے سے تقریر اور خطبہ میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس پر کہ خطیب آگے بڑھ رہا ہوتا ہے' لیکن درمیان میں دائیں بائیں' ادھر ادھر کی بات کرتا ہے' کبھی کوئی لطیفہ آگیا تو وہ بھی سنا دیا' کبھی کوئی اور ایسی بات کر دی جس سے رونا بھی آگیا' لیکن یہ کہ جو خاص بات وہ کہنا چاہتا ہے وہ اس کو درجہ بدرجہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ذہنوں میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر میں آکر بڑی جامع بات کہہ کر گفتگو ختم کرتا ہے' جس سے ایک آخری تاثر ذہنوں پر مترتب ہوتا ہے۔ اب جنہوں نے یہ خطبہ سنا ہے وہ کوئی مستقل تاثر لے کر اٹھیں گے۔ یہی سارے اوصاف آپ کو قرآن میں نظر آئیں گے۔ چنانچہ قرآن میں اکثر سورتوں کی ابتدائی آیتیں جن کو ہم فواتح سُوَر کہتے ہیں اور اختتامی آیات جنہیں خواتم سُوَر کہتے ہیں' بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ فواتح و خواتم آپ کو اکثر و بیشتر سورتوں میں ملیں گے۔ ابتدائی آیات بڑی اہم ہیں' بڑی پُر جلال' بڑی جامع' لوگوں کی توجہ کو کھینچ لینے والی اور اختتام پر بھی بڑی جامع باتیں آگئیں۔ اس طرح اگرچہ طویل سورتوں میں مضامین بے شمار آجاتے ہیں' لیکن آخر میں جو اصل نکتہ ہے اس پر لاکر بات کو مرکوز کر دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

قرآن مجید کے تعارف کے حوالے سے یہ بہت ہی اہم حصہ ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ترکیب کیا ہوتی ہے اور پھر یہ کہ قرآن کی ترکیب کسے کہتے ہیں۔ مرکب شے وہ ہے جو کچھ اجزاء سے مل کر بنی ہے۔ مفرد اور مرکب میں فرق ہے۔ اب دیکھئے کہ قرآن کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ کلام کلمات سے بنتا ہے۔ اسم' فعل' حرف' یہ سب کلمات کہلاتے ہیں۔ ان کلمات کو جوڑ کر آپ کلام بناتے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن مجید کا ابتدائی یونٹ "آیت" ہے اور آیتیں سورتوں کی شکل میں جمع ہیں۔ اس کی صرف یہی دو بنیادی اصطلاحات ہیں۔ آیت جملہ نہیں ہے۔ آیت کو ہم شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ بدقسمتی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو اس کے لئے Verse ہی کا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ آیت کے لئے آپ کوئی دوسری اصطلاح استعمال کر بھی لیں تب بھی آیت کا مفہوم وہی رہے گا جو ہے' آیت Verse نہیں کہلائے گی۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیت کے لفظی معنی کیا ہیں؟ آیت کے لفظی معنی "نشانی" کے ہیں۔ گویا قرآن مجید کی ہر آیت اللہ کے علم و حکمت کی ایک نشانی ہے۔ یہ اللہ کے کمالِ علم' کمالِ حکمت کی نشانیاں ہیں۔ جیسے کہ آیات آفاقی ہیں۔ آسمان' زمین' سورج' چاند' رات' دن' یہ سب کیا ہیں؟ یہ اللہ کی آیات ہیں ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ یہ سب آفاقی آیات ہیں۔ اسی طریقے سے قرآن مجید کی ابتدائی اکائی آیت ہے۔ یہ آیات صرف حروف پر بھی مشتمل ہیں جیسے "الٓمّٓ" یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں لیکن آیت تو ہو گئی۔ آیت مرکبات ناقصہ پر بھی مشتمل ہے' جیسے "وَالْعَصْرِ" اب اسے گرائمر کی رو سے مرکب ناقص کہیں گے' اس لئے کہ بات پوری نہیں ہوئی۔ "وَالْعَصْرِ" زمانے کی قسم ہے! سوال پیدا ہوتا ہے کس بات پر قسم ہے؟ جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ کس چیز پر قسم کھا رہے ہیں تو بات کچھ بھی نہیں ہوئی۔ جملہ اس کو کہتے ہیں جس میں کہ بات مکمل ہو گئی ہو۔ یہ جملہ نہیں ہے' اس لئے کہ یہ کلام مفید نہیں ہے۔ لیکن قرآن مجید کی ایسی آیتیں بے شمار ہیں جو مرکبات ناقصہ ہیں۔ تیسرے یہ کہ ایک جملے پر بھی آیت ہو سکتی ہے۔ جیسے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" یہ ایک مکمل جملہ ہے' اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔ آیت الکرسی ذرا پڑھئے تو اس میں سے دس جملے نکل آئیں گے۔ اس بات کو اچھی طرح نوٹ کر لیجئے کہ آیت کو ہمیشہ آیت ہی کہنا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں کسی زبان کا کوئی متبادل اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

یہاں ایک اور سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ یہ آیت ہے۔ جان لیجئے کہ یہ توقیفی امر ہے۔ یہ حضور ﷺ کے بتانے سے پتہ چلا ہے کہ "وَالْعَصْرِ" ایک آیت ہو گئی ہے' "الٓمّٓ" ایک آیت ہو گئی ہے' جبکہ "الٓرٰ" آیت نہیں ہوئی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ وہی تین حروفِ مقطعات ہیں۔ عقل کہتی ہے آیت ہونی چاہئے۔ لیکن یہاں نہ تو گرائمر کا اصول ہے' نہ منطق کا اصول ہے' نہ کوئی اور آپ کا اصول اس میں کارگر ہو گا۔ یہاں صرف یہ بات چلے گی کہ محمد ﷺ نے کیا فرمایا ہے۔ اس کے لئے "توقیفی امر" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ توقیفی امور موقوف علیہ ہیں

حضور ﷺ کے بتانے پر۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی طرف دو روایات منسوب ہیں تو ان کی بنیاد پر دو آراء ہو سکتی ہیں۔ کوئی شخص اپنی دلیل سے' اپنے استدلال سے طے نہیں کر سکتا کہ یہ آیت ہے۔ صرف حضورؐ کے بتانے سے طے ہو گا کہ یہ آیت ہے۔

آیات کی تعداد؟ : قرآن مجید کی آیات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کی چھ ہزار سے کچھ اوپر آیات ہیں۔ بعض حضرات چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) بھی کہتے ہیں۔ بعض چھ ہزار اور ڈھائی تین سو بھی کہتے ہیں۔ اس تعداد میں بڑے بڑے فرق اس وجہ سے بھی ہو گئے ہیں کہ ایک سو تیرہ مرتبہ آیتِ "بسم اللہ" آتی ہے جبکہ اس میں اختلاف ہے کہ آیت "بسم اللہ" کو ہر مرتبہ گنا جائے یا نہ گنا جائے۔ اگر یہ ایک آیت ہے تو گویا کہ ایک سو تیرہ کی تعداد کم ہو گئی۔ ایک مرتبہ تو یہ ایک سورۃ کے اندر بھی موجود ہے' حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو خط لکھا تھا ملکہ سبا کو اس کا آغاز یوں ہوا : ﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اس سورۃ کے علاوہ یہ ایک سو تیرہ سورتوں سے پہلے بھی موجود ہے۔ ہر مرتبہ شمار کریں گے تو ایک سو تیرہ کا عدد بڑھ جائے گا لہٰذا آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ البتہ ذہن میں اندازہ رکھئے کہ یہ تعداد چھ ہزار سے کچھ اوپر ہے۔

سورۃ کسے کہتے ہیں؟ : اب ہم یہ دیکھیں گے کہ سورۃ کسے کہتے ہیں۔ سورۃ کا لفظ "سُور" سے بنا ہے اور اس کے معنی فصیل کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ سورۂ حدید میں آتا ہے ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ پرانے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ہر شہر کے گرد اگر دایک فصیل ہوتی تھی' جو اس کی حفاظت کرتی تھی۔ اب اس فصیل کے اندر جو شہر ہے' اس کی Lay out ہے' اس کا گراؤنڈ ہے' یا کوئی مارکیٹ کی جگہ ہے' اس کے مختلف محلے ہیں' فصیل اس سب کی حفاظت کر رہی ہے۔ تو قرآن مجید میں آیات کو ان سورتوں کی شکل میں جمع کر دیا گیا ہے۔ گویا کہ ہر سورۃ ایک شہر بن گیا ہے۔ یعنی معانی اور علم و حکمت کا ایک شہر۔ اس شہر کا اپنا ایک نظام اور لے آؤٹ ہے' اس کا اپنا نقشہ ہے۔

اب اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ سورتیں بھی حضور ﷺ کی بتائی ہوئی ہیں۔ الحمدللہ کہ سورتوں کے بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن مجید کی کُل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی ہیں۔ کم از کم تین آیتوں کی بھی سورتیں ہیں اور ایسی چھوٹی سورتوں کی تعداد بھی تین ہی ہے۔ یہ سورۃ الکوثر' سورۃ النصر اور سورۃ العصر ہیں۔ اس کے بالکل برعکس سورۂ بقرہ بھی ہے جو ۲۸۶ آیات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کہ اس میں ایک ایک آیت دس دس جملوں پر بھی مشتمل ہے' مثلاً "آیت الکرسی"۔ اسی طرح "آیت البِر" بھی بہت طویل آیت ہے۔ آخری پارے کی کئی سورتیں حجم میں "آیت الکرسی" سے کم ہیں۔ سورتوں کی تعداد اور ترتیب بھی توقیفی امر ہے۔

سورتوں کے علاوہ دورِ نبوی اور دورِ صحابہؓ میں ہمیں ایک اور لفظ ملتا ہے اور وہ "حزب" یا "منزل" ہے۔ سورتوں کی یہ گروپنگ اس اعتبار سے ہے کہ اگر ہر ہفتے کوئی شخص قرآن مجید ختم کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے قرآن کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عموماً قرآن حکیم کی تلاوت رات کو نوافل میں ہی کھڑے ہو کر کرتے تھے۔ اس لئے کہ دن کے اوقات میں محنت و مشقت سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ تو اصل میں قرآن پڑھنے کا وقت رات کا ہے۔ تلاوت کی ایک مقررہ مقدار ہر شخص کا معمول تھا۔ کسی شخص کا معمول ہے کہ رات کو اتنا قرآن پڑھنا ہے' کسی روز اس پر نیند کا ایسا غلبہ ہو گیا کہ نہیں پڑھ سکا تو وہ اسے دن میں مکمل کر لیتا۔ یہ حضورؐ نے تاکید فرمائی تھی۔ یعنی کسی کا جو بھی نصاب ہے' اگر کسی وجہ سے وہ رات کو نہ پڑھ سکے تو دن میں پورا کر لے۔ گویا کہ عہدِ نبوی میں "حزب" کا لفظ موجود تھا۔ اسی طریقے سے "منزل" کا لفظ موجود تھا۔ ان منزلوں کے اندر جو دو خوبیاں ہیں ان کو ذہن میں رکھئے۔ یہاں یہ نہیں کیا گیا کہ صفحے گن کر برابر برابر تقسیم کر بیٹھے' یہ تو بدذوقی کی بات ہے۔ بلکہ اس تقسیم میں سورتیں مکمل لی گئی ہیں چاہے کوئی حصہ زیادہ بڑا بھی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی منزل پونے پانچ پارے کی ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ عددی اعتبار سے پہلی منزل میں تین سورتیں ہیں۔ سورۂ فاتحہ کو چھوڑ دیجئے' اس لئے کہ یہ پورے قرآن کا دیباچہ و مقدمہ ہے۔ پہلی منزل میں سورۃ البقرہ' سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء

ہیں۔ اگلی منزل میں پانچ سورتیں ہیں۔ پھر اگلی منزل میں سات سورتیں ہیں۔ اس سے اگلی میں نو سورتیں ہیں۔ اس سے اگلی میں گیارہ سورتیں ہیں۔ اس سے اگلی میں تیرہ سورتیں ہیں۔ اور ساتواں حزب جو "حزبِ مفصّل" کہلاتا ہے اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ اس لئے کہ ۳۵ سورتیں تو آخری پارے میں ہی ہیں۔ لیکن وہ بھی تیرہ اور پانچ کا حاصل ضرب (یعنی ۶۵) ہے۔ اس طرح ایک عددی حسن پیدا ہو گیا ہے' ان دونوں خوبیوں کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ ایک یہ کہ ان منزلوں یا احزاب میں سورتوں کی فصیل نہیں ٹوٹتی۔ دوسری بات یہ کہ اس میں ایک بڑی اچھی ترتیب میں سورتوں کی تعداد بڑھتی ہے۔

پاروں اور رکوعوں کی تقسیم : قرآن کے مذکورہ بالا اجزائے ترکیبی دور صحابہ میں موجود تھے جبکہ دو کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔ ایک اضافہ تو حجاج بن یوسف کے دور میں ہوا ہے اور ایک غالباً اس کے بھی بعد۔ حجاج بن یوسف نے ایک تو قرآن مجید پر نقطے لگوائے اور زبر زیر وغیرہ علامات لگوائیں۔ ورنہ اس سے پہلے قرآن مجید میں نہ نقطے تھے' نہ ہی رموزِ اوقاف تھے' نہ ہی زیر زبر تھے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پرانے زمانے میں جو بڑا قسم کا منشی ہوتا تھا' جب وہ خط شکستہ میں لکھتا تھا تو وہ نقطے نہیں لگاتا تھا' بلکہ اگر کسی پڑھے لکھے آدمی کو نقطے لگا کر تحریر بھیج دی جاتی تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتا تھا کہ مجھے جاہل سمجھا ہے کہ نقطے بھی لگائے ہیں' کیا میں بغیر نقطے کے عبارت کو سمجھ نہیں سکتا؟ عرب چونکہ صاحبِ لسان تھے' لہٰذا انہیں نقطوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور قرآن مجید تو چونکہ اصل میں زبان سے زبان تک منتقل ہوا ہے' پڑھنے کے ذریعے سے' تو شروع میں جو مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں تیار ہوئے ہیں ان میں بھی نقطے نہیں ہیں۔ نقطوں اور حرکات کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب غیرِ عرب لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے' ان کو قرآن سمجھنے کے لئے حرکات اور نقطوں کی ضرورت تھی۔ عربی عربوں کی تو اپنی زبان تھی لہٰذا انہیں نقطوں اور حرکات کی احتیاج نہیں تھی۔

حجاج بن یوسف نے دوسرا کام رکوعوں کی تقسیم کا کیا۔ بڑی سورتوں کو اس نے رکوعوں میں تقسیم کروایا۔ یہ رکوع بنا ہے "رکعت" سے۔ اب سورۂ بقرہ ایک رکعت میں

تو نہیں پڑھی جا سکتی لہٰذا اس کے لئے رکوع بنائے گئے تا کہ ایک قاری اور نمازی جتنا حصہ پڑھے وہ بامعنی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی جگہ رکے جہاں مضمون ادھورا رہ گیا ہو' بات نامکمل رہ جائے۔ گویا کہ مضمون کے اعتبار سے ایسے حصے بنا دیئے جائیں کہ ہر رکعت میں اتنا حصہ پڑھ لیا جائے تو معنی برقرار رہیں۔ رکوعوں کی تقسیم میں اکثر و بیشتر مضامین کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ تقسیم چونکہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی لہٰذا اس کے بارے میں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ عرب ممالک میں جو قرآن چھپتے ہیں ان میں رکوع نہیں ہیں۔ انہوں نے "حزب" کے نام سے ایک اور تقسیم شروع کر دی ہے۔ وہاں رکوعوں کی تقسیم ہی نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے' اس لئے کہ یہ خود حضور ﷺ کے زمانے میں بھی نہیں تھی۔ اس میں بہرحال اختلاف کی گنجائش ہے۔ لہٰذا کوئی کہہ سکتا ہے کہ رکوع یہاں ختم نہ ہوتا بلکہ یہاں ہوتا تو بہتر تھا۔ لیکن میں نے جتنا غور کیا ہے شاذ ہی کچھ مقامات ایسے ہیں کہ جہاں محسوس ہوتا ہے کہ وہاں رکوع کی جو تقسیم ہے اس میں improvement کی گنجائش موجود ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے وہاں ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔

اس تقسیم کی حد تک جو بات ہوئی ہے وہ خوبصورتی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس کے آگے چل کر قرآن کے جو تیس پارے بنائے گئے ہیں' یہ بڑے بھونڈے انداز میں بنائے گئے ہیں۔ یہ کسی ایسے شخص نے بنائے ہیں جس نے قرآن کو برابر برابر تیس حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ سورۃ کی فصیل ٹوٹ رہی ہے! چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ سورۂ حجر کی ایک آیت تیرھویں پارے میں ہے جبکہ باقی ساری سورۃ چودھویں پارے میں ہے۔ سورتوں کو توڑنے کی ایسی ایسی شکلیں اچھی نہیں ہیں اور یہ انداز گراں گزرتا ہے۔

پاروں کی یہ تقسیم کیوں وجود میں آئی؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں کا جوش دینی و ایمانی کم پڑ گیا تو ہر مہینے میں ایک دفعہ ختم قرآن کی غرض سے قرآن کو تیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہفتے میں قرآن ختم کرنا مشکل ہو گیا تو یہ تقسیم وجود میں آئی۔ بہرحال یہ پاروں میں قرآن کی بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔ یہ بات میں بلا جھجک کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ حضورؐ اور صحابہ کے زمانے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو حجاج بن یوسف

کے بھی بہت بعد کے زمانے کی بات ہے۔

ترتیب و تدوینِ قرآن

پہلی بات جو قرآن مجید کی ترتیب و تدوین کے ضمن میں متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی ترتیبِ نزولی اور تھی اور ترتیبِ مصحف کچھ اور ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں مکی سورتیں اور مدنی سورتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ ترتیب نزولی تو یہ ہونی چاہئے کہ پہلے ساری مکی سورتیں آئیں۔ مگر ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ جو پہلی وحی ہے وہ شروع میں نہیں ہے بلکہ شروع میں سورۂ فاتحہ ہے۔ اس حوالے سے اس میں تو کوئی اختلاف ہے ہی نہیں۔ یہ اجماعی بات ہے کہ قرآن کی جو ترتیب مصحف ہے' وہ ترتیبِ نزولی سے مختلف ہے۔

اہلِ تشیع کے حوالے سے جو بات میں نے کہی تھی کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ترتیبِ نزولی سے قرآن جمع کیا تھا تو میں یہ بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ حضرت علیؓ نے کوئی قرآن ترتیبِ نزولی پر مرتب کیا ہو۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ تو فہمِ قرآن اور تدبرِ قرآن کی ایک کوشش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بعض انگریزی مترجمین نے بھی یہ کیا ہے کہ سورتوں کی ترتیب بدل دی ہے اور انہوں نے نزولی ترتیب میں' جو بھی انہیں سمجھ میں آئی ہے' قرآن کو مرتب کیا ہے' تاکہ ایک قاری کو سہولت ہو جائے کہ پہلے مکی سورتیں پڑھ لے اور اسے پتہ چلے کہ پہلے یہ مضامین آئے ہیں' پھر یہ مضامین۔ قرآن حکیم کے نزول کے اعتبار سے تیرہ سال مکی ہیں جنہیں تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی پہلے چار سال' درمیانی چار سال اور آخری چار سال۔ ظاہر بات ہے کہ ان تینوں ادوار کے مزاج میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے فرق ہے۔ چونکہ قرآن حالات و ضرورت کے مطابق نازل ہو رہا تھا تو ان کے مضامین میں فرق واقع ہوتا چلا جائے گا۔ اس اعتبار سے حضرت علیؓ نے اپنے فہمِ قرآن' تدبرِ قرآن اور قرآن مجید پر غور و فکر کے لئے کوئی نسخہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے بھی مرتب کر لیا ہو تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی غلط بات ہے۔ لیکن قرآن کی اصل ترتیب ترتیبِ مصحف ہے اور یہی وہ ترتیب ہے

جس پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے مصحف کو مرتب فرمایا ہے۔ اب اہل تشیع سب کے سب تو نہیں' بہرحال ان میں کچھ لوگ ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ اصل قرآن تو وہی ہے کہ جو حضرت علیؓ نے مرتب کیا تھا۔ اسی لئے اس کو "مصحفِ عثمان" کہتے ہیں۔ وہ "قرآن" تو کہتے ہی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس پر لفظ "قرآن" کا اطلاق وہ اپنے عقیدے کی رو سے صحیح نہیں سمجھتے۔ اس لحاظ سے مصحفِ عثمان کا لفظ آپ کو زیادہ تر اہل تشیع کی زبان اور قلم پر ملے گا۔ ویسے اس لفظ کے استعمال کرنے میں غلطی بھی نہیں ہے۔ "مصحفِ عثمان" کی یہ اصطلاح اپنی جگہ پر صحیح ہے' لیکن وہ اسے جو استعمال کرتے ہیں تو دراصل اس غلط نظریئے کی وجہ سے استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال جو اس کی موجودہ ترتیب ہے وہ وہی ہے جو لوح محفوظ کی ترتیب ہے۔ یہی ہے جو "کتاب مکنون" کی ترتیب ہے۔ اور یہی ہے کہ جس پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے اس کو مرتب کیا ہے۔

تدوینِ قرآن کے مراحل : اس کی تدوین کے تین مراحل ہیں۔ یہ بات البتہ علمی طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں قرآن مرتب ہو گیا تھا۔ سورتیں مکمل ہو گئی تھیں' سورتوں کی ترتیب معین ہو گئی تھی' لیکن کتابی شکل میں کوئی حصہ مکمل موجود نہیں تھا۔ جو حقائق ہیں وہ ہم مانتے ہیں' اس لئے کہ بنیادی طور پر قرآن زبان سے زبان تک منتقل ہوا۔ حضورؐ نے پڑھا' صحابہؓ نے سنا اور یاد کر لیا۔ اب قاری حضرات ہیں جو اس کو آگے پھیلا رہے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو حضورؐ نے مدینہ منورہ بھیجا تھا' جہاں ان کا نام ہی "مقری" پڑ گیا تھا یعنی پڑھانے والا۔ قاری کے معنی ہیں پڑھنے والا' اور اسی سے باب افعال میں اسم فاعل بنے گا "مقری" یعنی پڑھانے والا۔ تو جو ہمارے ہاں قراءت کا فن ہے یہ سارا در حقیقت سماعت کے ذریعے سے وجود میں آیا ہے۔ استاد پڑھتا ہے اور شاگرد سنتا ہے۔ اس کے ذریعے سے در حقیقت وہ قرآن کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ بہرحال حضور ﷺ کے زمانے تک سورتوں کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی آیت اُتری تو حضورؐ نے فرمایا کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد درج کر لو یا یاد کرو۔ تو گویا کہ سورتوں کی تکمیل و تدوین حضورؐ کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ اسی لئے صحیح حدیث کی رو سے ہر رمضان المبارک میں حضرت جبرئیلؑ آتے تھے

اور حضورؐ ان کے ساتھ قرآن کا دورہ کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دور اسی حصے کا ہوتا تھا جو اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا۔ رمضان المبارک میں دورہ کا معمول ایک مسنون عمل ہے۔ آج کل بھی جب رمضان آتا ہے تو قاری حضرات قرآن کا دورہ کرتے ہیں' اسے تازہ کرتے ہیں۔ رمضان المبارک میں حضورؐ اور حضرت جبرائیلؑ دورہ کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو سکھانے والے کون تھے؟ حضرت جبرائیلؑ تھے۔ ان سے سنا ہے اور حضورؐ نے اس کو اخذ کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضورؐ جو دورہ فرماتے تھے وہ ترتیب کے بغیر تو نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا جو آخری رمضان مبارک تھا' اس میں آپ نے دو مرتبہ قرآن کا دورہ مکمل کیا تھا۔

چنانچہ سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے قرآن کی تدوین آپ کے زمانے میں آپؐ ہی کے حکم سے' آپؐ ہی کی منشاء کے مطابق مکمل ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں ایک کمی تھی' اور وہ کمی یہ تھی کہ کوئی ایک نسخہ کتاب کی شکل میں' مجلد شکل میں حضورؐ کے زمانے میں نہیں تھا۔ اس کی ضرورت کا احساس تب ہوا جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگیں شروع ہوئی ہیں۔ مسیلمہ کذاب کی بڑی قوت جمع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ جو جنگ ہوئی جسے جنگِ یمامہ کہا جاتا ہے' اس میں چھ سو حفاظ شہید ہو گئے تھے۔ اس موقع پر تشویش پیدا ہو گئی کہ اگر قرآن کو لکھی ہوئی شکل میں' کتابی صورت میں محفوظ نہ کر لیا گیا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ قرآن کہیں گم نہ ہو جائے۔ لہٰذا ایک تجویز پیش ہوئی کہ قرآن کو اب کتاب کی شکل میں بھی جمع کر لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کافی دیر تک یہ بات مانی ہی نہیں۔ ان کی دلیل کیا تھی؟ انہوں نے کہا کہ یہ کام حضورؐ نے نہیں کیا' میں کیسے کروں؟ یہ تو حضورؐ کی اتباع کا جذبہ تھا' جیسے کہ انہوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اگر یہ منکرینِ زکوٰۃ حضورؐ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ باندھنے والی رسیاں بھی دے دیتے تھے اور آج کہیں کہ اونٹ لے جاؤ رسیاں دے جاؤ' تب بھی میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ اس لئے کہ دین میں اس درجہ کی ترمیم بھی مجھے گوارا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا : "اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟" یعنی "کیا دین میں تبدیلی کر دی جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں"۔ اسی طرح قرآن کو کتابی شکل میں مدوّن کرنے کے معاملے میں

بھی ابوبکرؓ پریشان تھے' لیکن اس کام کے حق میں دلائل اتنے قوی تھے کہ سب صحابہ کا اس بات پر اجماع ہو گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی بات مان لی۔ پھر جو حضورؐ کے زمانے میں کاتبینِ وحی تھے' زیدؓ بن ثابتؓ' حضرت علیؓ' حضرت معاویہؓ' یہ وہ لوگ ہیں جو حضورؐ کے سیکریٹریز تھے۔ حضورؐ تو دنیاوی اعتبار سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ آپؐ "اُمّی" تھے اور یہ حضرات آپؐ کے سیکریٹریز کاتبینِ وحی تھے۔ جب بھی کوئی آیات نازل ہوتی تھیں تو یہ حضرات حضورؐ کے حکم سے لکھ لیا کرتے تھے۔ ان حضرات کا ایک بورڈ بنایا گیا' اور زیدؓ بن ثابت ان کے چیف بنائے گئے۔ انہوں نے پھر اس کو کتاب کی شکل میں یعنی "مابَیْنَ الدَّفَّتَیْن" مدون کیا۔ "دُفّۃ" کہتے ہیں گتے کو' جیسے دو گتوں کے اندر کتاب آجاتی ہے۔ گویا باقاعدہ کتابی صورت میں قرآن کی تدوین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ اس سے پہلے قرآن مجید اس شکل میں موجود نہیں تھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ کتابی صورت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں تدوین ہوئی جو عہدِ نبوت سے بالکل متصل ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ سینکڑوں سال بیت گئے ہوں۔

اب ہم قرآن حکیم کی تدوین کے تیسرے مرحلے کی طرف آتے ہیں۔ قرآن کو پڑھنے کے ضمن میں حضورؐ نے ایک آزادی دی تھی۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مختلف علاقوں کے مختلف لہجے ہوتے ہیں۔ ایک ہی لفظ ہے' اس کو کوئی شخص کسی اور طریقے سے ادا کرتا ہے جبکہ کوئی دوسرا شخص کسی اور طور سے۔ حضورؐ نے شروع میں اس بات کی اجازت دی تھی کہ ہر شخص اپنے لہجے کے مطابق قرآن پڑھ سکتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کی مثال بہت سادہ ہے۔ دیہات میں کچھ لوگ "چاقو" کو "قاچُو" کہتے ہیں۔ حضورؐ کی اس اجازت کا نتیجہ کیا نکلا؟ اب لوگ لکھنے میں بھی وہی لہجہ اپنانے لگے۔ ظاہر ہے کہ جب آپ "چاقو" کو "قاچو" یا "کاچو" لکھیں گے تو بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ اس حوالے سے جب لوگوں میں یہ فرق ہونے لگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں اب ایک متفق علیہ "ٹیکسٹ" تیار کیا گیا۔ یہ تدوین قرآن کا تیسرا مرحلہ ہے۔

کیا حضرت عثمان جامع القرآن ہیں؟ : بدقسمتی سے ہمارے ہاں خطبے میں خطیب حضرات قافیہ ملانے کے لئے حضرت عثمان کے نامِ گرامی کے ساتھ "جامع القرآن عثمانؓ بن

عفان" کے الفاظ کہہ دیتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ "جامعُ القرآن" کا ترجمہ ہوتا ہے "قرآن کو جمع کرنے والا"۔ اب گویا کہ ہم خود ان الفاظ کے ذریعے سے ہر سننے والے کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا کر رہے ہیں کہ حضرت عثمانؓ سے پہلے کے زمانے میں شاید قرآن جمع ہی نہیں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کا زمانۂ خلافت حضورؐ کے عہدِ مبارک کے تقریباً بارہ برس بعد کا ہے۔ پھر بارہ برس ان کے دورِ خلافت کا طویل عرصہ ہے۔ اگر اس کے درمیانی چھ برس بھی لے لئے جائیں تو اندازہ ہوا کہ حضورؐ کے بیس برس کے بعد قرآن جمع ہو رہا ہے۔ اب یہ وسوسہ ذہن میں بیٹھ جائے گا تو بڑے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ بیس برس میں تو کافی چیزیں گم بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ تو خاصا لمبا عرصہ ہے۔ بقول شاعر ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔ حضرت عثمانؓ اصل میں "جامعُ الامّۃِ علی القرآن" ہیں۔ یعنی امت کو ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے۔ آپؓ کے دورِ خلافت میں قرآن کا ایک متفق علیہ مسودہ (SCRIPT) تیار کیا گیا کہ اب قرآن اس طریقے سے لکھا جائے گا۔ اس لئے اس کو "مصحفِ عثمانؓ" کہتے ہیں اور اس کے خط کو "رسمِ عثمانی" کہتے ہیں۔ آج قرآن رسم عثمانی پر ہے۔ میں آپ کو اس کی ایک مثال بتا دیتا ہوں۔ رسم عثمانی کے مطابق سورۂ فاتحہ میں "ملک یوم الدین" ہے' اگر ہم آج سے "مالک" لکھیں گے تو یہ غلط ہو گا۔ حضرت عثمانؓ کے نسخے میں "ملک" لکھا ہوا ہے یعنی میم پر کھڑا زبر ہے' میم کے بعد الف نہیں ہے۔ چونکہ قراءتیں دو ہیں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بھی ہے اور "مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" بھی ہے۔ لہٰذا جب آپ اس طور سے لکھیں گے "ملک" تو یہ "مٰلِكِ" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "مَلِكِ" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر "مالک" کر دیں گے تو "مَلِكِ" پڑھنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا' اس کا تلفظ صرف "مَالِكِ" ہی رہ جائے گا۔ اس اعتبار سے اس رسم الخط کو پورے طور سے Follow کرنا بہت ضروری ہے۔ درحقیقت حضرت عثمانؓ نے جو خدمتِ قرآن فرمائی اس کے اعتبار سے آپ "جامعُ آیاتِ القرآن" نہیں ہیں بلکہ "جامع الامۃ علی الرسم الواحد" ہیں۔ یعنی ایک رسم الخط پر پوری امت کو حضرت عثمانؓ نے جمع کیا ہے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بنی' انہوں نے قرآن مجید کا ٹیکسٹ لکھا' پھر اس کی نقول تیار

کی گئیں' اس کے چھ سات نسخے تیار کروائے گئے۔ ایک نسخہ مدینہ منورہ میں تھا۔ ایک نسخہ مکہ مکرمہ بھیج دیا گیا' ایک دمشق گیا' ایک کوفہ گیا' ایک بحرین گیا' ایک یمن گیا اور ایک بصرہ گیا۔ گویا کہ مختلف علاقوں میں یہ نسخے لے جائے گئے۔ ان میں سے ایک نسخہ تاشقند میں تھا۔ انہی میں سے ایک نسخہ استنبول میں ہے۔ ایک نسخہ حضرت عثمان نے اپنے پاس رکھا تھا۔ وہ اس پر تلاوت فرما رہے تھے جب ان کو شہید کیا گیا' لہٰذا اس نسخے پر ان کے خون کا دھبہ آج تک موجود ہے۔ پہلے پارے کے آخری رکوع میں فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ کے الفاظ پر حضرت عثمانؓ کے خون کا دھبہ لگا ہوا ہے۔

دورِ حاضر میں قرآنی خدمات : ہمارے ہاں جب مختلف کاروباری اداروں نے قرآن حکیم شائع کرنا شروع کئے تو ان میں رسم الخط کی بڑی غلطیاں تھیں۔ اس لئے حکومت نے ہمارے ہاں بھی قانون بنایا ہوا ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ قرآن شائع نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ معین تصحیح کرنے والے اشخاص کا سرٹیفکیٹ نہ حاصل کرے۔ اس حوالے سے اس دور میں سب سے بڑی خدمت سعودی عرب کی ہے کہ انہوں نے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں رسم عثمانی کا مصحف شائع کیا ہے اور اس کو دنیا بھر میں تقسیم کیا ہے۔ ایک زمانے میں وہ ہر حاجی کو قرآن مجید دے رہے تھے' بہت دبیز آرٹ پیپر پر دیدہ زیب طباعت اور بہت عمدہ جلد کے ساتھ۔ تو یہ کام ہے جو اس دور میں ہوا ہے۔ یہ قرآن کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ایک خدمت وہ بھی تھی کہ جو مصر کے صدر ناصر کے حصے میں آئی تھی۔ جب اسرائیل نیا نیا قائم ہوا تھا تو یہودیوں نے قرآن مجید میں تحریف کی کوشش کی۔ لہٰذا انہوں نے اس کے کچھ غلط نسخے چھاپ کر بہت بڑی تعداد میں افریقہ کے ممالک میں پھیلا دیئے۔ اب ظاہر بات ہے کہ کسی کو وہ قرآن ملا تو وہ اس کو قرآن ہی سمجھ کے پڑھ رہا ہے' جبکہ اس میں کچھ اور لکھا ہوا ہے۔ سو سال بعد کسی کو ملے گا تو وہ سمجھے گا کہ یہی قرآن ہے' یا یہ کہ کم از کم اختلاف تو ہو جائے گا کہ سو سال پرانا قرآن ہے' اس میں تو یہ لکھا ہوا ہے!! یہ بہت بڑی سازش تھی۔ گویا کہ اب تک مسلمانوں کے پاس جو ایک بڑی قیمتی متاع موجود ہے کہ قرآن کے متن میں اختلاف کہیں نہیں ہے۔ آپ مشرقِ اقصیٰ سے کوئی نسخہ لے لیجئے اور مغربِ

اقصیٰ سے لے لیجئے' ٹیکسٹ میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ یہ قرآن کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے سازش کی۔ اس وقت صدر ناصر نے اس کا توڑ یہ کیا تھا کہ پورے قرآن مجید کو ترتیل کی شکل میں دو قاریوں سے پڑھوایا اور اس کے کیسٹ تیار کر کے پوری دنیا میں پھیلا دیئے۔ وہ دو قاری' محمود خلیل الحصری اور عبدالباسط محمد عبدالصمد ہیں۔ یہ دونوں چوٹی کے قُراء تھے۔

بہرحال قرآن حکیم کی تدوین کے یہ تین مراحل ہیں۔ یہ کام عہدِ رسالت کے بہت ہی قریب میں مکمل ہو گیا تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ کے بارہ سال بھی شامل کر لیں تو ایک ربع صدی کے اندر یہ تمام مراحل طے ہو چکے تھے۔ گویا کہ قرآن اپنی ترتیب و تدوین کے ساتھ زبانی اور سینوں میں حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں ہی جمع ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن مجید "مابین الدَّفَتین" یعنی کتابی صورت میں جمع ہو گیا۔ جبکہ ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر مسلمانوں کو جمع کرنے کا مرحلہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مکمل ہوا۔

حرف آخر

اب میں چند باتیں ابتداء میں تلاوت کی جانے والی آیات کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ سورۃ الواقعہ میں فرمایا : ﴿ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ ﴾ "تو نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان جگہوں کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں"۔ "وقع" کے معنی پڑنا کے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس وقت لوگوں نے "مواقع النجوم" سے کیا سمجھا ہو گا۔ اس کے کیا معنی و مراد ہیں' آج ہمیں معلوم ہے ایک "Black Hole" کا نظریہ ہے۔ آج کی سائنس بتا رہی ہے کہ اس کائنات کے اندر ایسے بلیک ہولز ہیں جہاں پوری کی پوری ارب ہا ارب میل لمبی کہکشائیں (Galaxies) ختم ہو کر' سکڑ کر ایک دھبہ بن کر رہ گئی ہیں۔ تو یہ "Black Holes" جو ہیں یہ "مواقع النجوم" ہیں۔ ﴿ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں : "اور یقیناً یہ قسم' اگر تم جانو تو بہت بڑی قسم ہے"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ

وہ کیسے جان سکتے تھے۔ آج سے چودہ سو برس قبل کا انسان یہ کیسے جان سکتا تھا۔ بہرحال فرمایا کہ اگر تم جانو تو بہت بڑی قسم ہے جو میں کھا رہا ہوں۔ اب یہ قسم کھا کر فرمایا گیا ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ "یہ بہت ہی باعزت قرآن ہے"۔ ﴿فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝﴾ اصل اس کی جو ہے وہ ایک ایسی کتاب میں ہے جو چھپی ہوئی ہے' وہ سامنے نہیں ہے۔ وہ تو "لوحِ محفوظ" ہے' وہ تو بہت بڑی کتاب ہے' "ام الکتاب" ہے۔ آگے فرمایا ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝﴾ "اس کو چھو ہی نہیں سکتے مگر وہ جو نہایت پاک ہیں"۔ وہ لوح محفوظ میں ہے اور اس کو چھونے والے تو فرشتے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ قرآن جو معنوی طور پر تمہارے سامنے ہے اس تک بھی تطہیر اور تزکیہ کے بغیر تمہاری رسائی نہیں ہو سکے گی۔ الفاظ پڑھ لو گے لیکن مفہوم تک نہیں پہنچو گے' جب تک کہ تمہاری نیتیں صاف نہ ہو جائیں۔ جب تک تطہیر اور تزکیہ کا عمل نہ ہو جائے اس وقت تک قرآن کے حقیقی علوم و معارف تک تم نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اسی سے یہ مفہوم بھی لیا گیا ہے کہ وضو کے بغیر اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ گویا کہ ایک ہی آیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اگلی آیت ہے ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ "اس ہستی کی طرف سے اس کو نازل کیا گیا ہے جو پروردگارِ عالم ہے"۔ آگے الفاظ ہیں ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝﴾ تو کیا اس جیسی بات کے لئے تم سستی اور کسل کر رہے ہو"۔ باقی سب کچھ سمجھ کر پڑھتے ہو اور اسے بے سمجھے پڑھ رہے ہو۔ نامعلوم کتنی محنتیں کرتے ہو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لئے۔ یہاں تک کہ تم انہیں امریکہ بھیج دیتے ہو۔ لیکن قرآن پڑھانے کی طرف تمہاری کوئی توجہ نہیں ہے۔ یہ ہے تمہاری سستی اور کسل مندی کی انتہا۔ گویا یہ کسل مندی تمہاری ناقدری کی غماز ہے۔ ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ "اور تم نے اپنا نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم جھٹلا رہے ہو"۔ اس کے دونوں معنی ہیں' اگر کفار سے خطاب ہے تو وہ جھٹلا رہے تھے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے' اور اگر مسلمانوں سے خطاب ہے تو ہمارا جو طرزِ عمل ہے وہ جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اگر قرآن کو ہم نہیں پڑھیں گے تو گویا کہ یہ اسے جھٹلانا ہے۔ قرآن پر عمل نہیں کریں گے تو گویا کہ جھٹلانا ہی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ
غیروں کی نظر میں

از : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

یہ مضمون چشتی صاحب مرحوم نے "سیرت صدیق اکبرؓ کانفرنس" منعقدہ برکت علی اسلامیہ ہال لاہور' میں مورخہ ۲۲/ جولائی ۱۹۷۳ء کو پڑھ کر سنایا تھا۔

صاحب صدر اور حاضرین مجلس!

میرے لئے اس محفل میں شرکت بلاشبہ باعثِ سعادت ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سیرت اس قدر پاکیزہ' دل کش اور بے عیب ہے کہ اغیار نے بھی ان کی عظمتِ ذاتی کا اعتراف کیا ہے اور صمیم قلب انہیں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

(۱) میں سب سے پہلے ہندوؤں کے مہاتما اور محسن اعظم مسٹر گاندھی کی رائے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں گا۔ جب ۱۹۳۷ء میں ملاعنہ فرنگ نے ہند کے باشندوں کو صوبہ جاتی خود مختاری عطا کی تو گاندھی نے اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ ہندو قوم کو (۱۹۴۷-۱۲۰۷=) ۷۴۰ سال کے بعد آزادی ملنے والی ہے۔ چونکہ وہ اس طویل مدت میں حکمرانی کے طور طریقے فراموش کر چکے ہیں اس لئے میں ان کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ "ہجرت" ابوبکر اور "ہجرت" عمر کے "اسوۂ حسنہ" کو پیش نظر رکھیں' کیونکہ تاریخ عالم ان سے بہتر حکمران ابھی تک ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکی ہے۔ یہ مشورہ دینے کے بعد گاندھی نے دونوں بزرگوں کی پاکیزہ شخصیت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا تھا اور صدیقِ

اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ اس قدر درویش صفت تھے کہ خلیفہ بن جانے کے بعد بھی عوام کی سیوا اسی طرح کرتے تھے جس طرح پہلے کرتے تھے۔

اس کے بعد عیسائی مصنفین کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

(۲) وان کریمر (Von Kramer) :

اپنی تالیف "The Orient under theCaliphs" میں لکھتا ہے :

Abu Bakr the successor and the representative of the Prophet in the highest affairs of the Muslim Community was a simple man to the old Arabian fashion and when summoned of the Caliphate he was changed in no respect.

مدینے کے نواح میں بمقام "سخ" نہایت سادگی سے رہتے تھے اور خلیفہ ہو جانے کے بعد سات ماہ تک روزانہ صبح کو ایسے وقت مدینے پہنچ جاتے تھے کہ مومنوں کو فجر کی نماز پڑھا سکیں۔ مدینے منتقل ہو جانے کے بعد بھی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف ایک خادم تھا جو گھر کا کام کرتا تھا اور بوقتِ فرصت مجاہدین کی تلواروں کو صاف کرتا تھا۔

(۳) ایچ جی ویلز (H.G.Wells) :

"روح اسلام کا مجسمۂ ظاہری آنحضرتؐ نہیں تھے بلکہ آپ کے جگری دوست اور معاون حضرت ابوبکرؓ تھے۔ اگر آنحضرت ابتدائی اسلام کا ذہن اور تخیل تھے تو ابوبکر اس کا ضمیر اور ارادہ تھے۔ دونوں کی زندگی ایک دوسرے کی رفاقت میں بسر ہوئی مگر اس طرح کہ محمد (ﷺ) نے جو بات بھی زبان سے نکالی ابوبکرؓ نے اس پر آمنا اور صدقنا کہا۔

محمد (ﷺ) کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے اس ایمان کا مظاہرہ کیا جس کی بدولت پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے ۶۲۸ء میں شاہان عالم کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ ابوبکرؓ نے اپنے آقا کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے فتوحات کا دروازہ کھول دیا اور اگر دنیائے اسلام میں ابوبکر کے پائے کے بیس آدمی اور ہوتے تو وہ ساری دنیا کو فتح کر لیتے"۔

(۴) سائیکلوپیڈیا آف اسلام :

"حضرت ابوبکرؓ کی سب سے بڑی خصوصیت وہ غیر متزلزل ایمان ہے جو وہ

آنحضرتؐ کی رسالت پر رکھتے تھے۔ معراج اور صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنے ایمان کی جس پختگی کا مظاہرہ انہوں نے کیا اس کے صلے میں بقول ابن اسحاق انہیں "الصدیق" کا لقب حاصل ہوا اور یہ لقب آج تک ان کے نام کا جزو لاینفک بنا ہوا ہے۔

نہایت رقیق القلب اور حلیم الطبع تھے۔ جب تلاوت کرتے تھے تو رقت طاری ہو جاتی تھی اور بقول حضرت عائشہ صدیقہؓ جب آنحضرتؐ نے ان سے کہا کہ تم ہجرت میں میرے رفیق سفر ہو گے تو فرطِ مسرت سے گریہ طاری ہو گیا۔ پیغمبر کی اخلاقی تعلیم کا ان پر بہت جلد اثر مرتب ہوتا تھا' جس کا ثبوت مسلمان غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینے سے مل سکتا ہے۔

ابوبکرؓ دین کی ترقی کے لئے ہمیشہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔ جب اسلام لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم نقد تھے لیکن بوقت ہجرت صرف ۵ ہزار رہ گئے تھے اور چلتے وقت انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ابوبکر نے قبول اسلام کے بعد ہجرت تک ہر نازک موقع پر اپنے آقا کا ساتھ دیا' ہر مصیبت کا رسول کے ساتھ شانہ بشانہ مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ان کی دنیاوی زندگی میں سب سے اعلیٰ مقام اس وقت آیا جب محمد (ﷺ) نے انہیں اپنا رفیق منتخب کیا اور اللہ نے ان کی ایثار آمیز رفاقت کو "ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ" کے لقب سے اسلام کی تاریخ میں غیر فانی بنا دیا۔

پیغمبر نے ۹ھ میں انہیں امیر الحج کا شرف عطا کیا اور میری تحقیق کے مطابق انہوں نے اعلان براءۃ لوگوں کو سنایا تھا نہ کہ حضرت علیؓ نے۔ جب محمد (ﷺ) بیمار ہوئے تو انہوں نے ابوبکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا اور اسی نمایاں خصوصیت کی بنا پر عمرؓ اور ان کے احباب (مثلاً ابن عوف' ابن جراح' ابن ابی وقاص' طلحہ وغیرہ) نے سقیفہ میں ابوبکر کو خلیفہ المسلمین منتخب کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔

چونکہ دین میں وہ کسی بدعت کے قائل نہیں تھے اور ان کی سیرت نہایت مستقیم تھی اس لئے وہ محمد ثانی یا مجسم محمد بن گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور تمام خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی وفات کے وقت امت کو ایسی مستحکم حالت میں چھوڑا کہ اس نے عمرؓ کے زمانے میں ان کی حکومت کو سہارا دیا۔ ابوبکر نے

اطاعتِ رسول کا بہترین نمونہ اس وقت پیش کیا جب انہوں نے نازک حالات کے باوجود جیشِ اسامہ کو روانہ کر دیا۔ ابوبکر نے بنو حنیفہ کو مغلوب کر کے اور مطیع اسلام کر کے وہ کارنامہ انجام دیا جو ان کے آقا بھی انجام نہیں دے سکے تھے۔

خلیفہ ہو کر بھی ابوبکرؓ نے اپنی سادگی کو برقرار رکھا۔ مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ابوبکر نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ مدنظر رکھا کہ سب مومن برابر کے حصہ دار ہیں۔ احادیث صحیحہ میں ان کی سادگی اور ان کے زہد و اتقاء کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے عہدے سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا اور مالدار ہونے کی کبھی تمنا نہیں کی۔[1]"

(۵) اسٹینلی لین پول "Studies in a Mosque" میں لکھتا ہے :

"ابوبکر کی سنجیدہ قوت فیصلہ اور محبت و شفقت سے لبریز دل' یہ دو خوبیاں اسلام کی ترقی کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئیں۔"

(۶) سائمن اوکلے "History of Saracens" میں لکھتا ہے :

"ابوبکرؓ نے بیت المال میں کبھی رقم جمع نہیں ہونے دی۔ ہر جمعہ کو نماز سے قبل جس قدر رقم ہوتی تھی سب مستحق افراد میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی صفات عفت و عصمت' زہد و ورع اور زخارف دنیوی سے بے تعلقی قابل تقلید تھیں۔ قبل وفات انہوں نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے کہا کہ جس قدر رقم میں نے بحیثیت خلیفۃ المسلمین بیت المال سے لی ہے سب میرے ذاتی اثاثے کو فروخت کر کے واپس کر دو۔ چنانچہ جب عمرؓ نے یہ بات سنی تو کہا "ابوبکرؓ نے اپنے جانشین کے سامنے نہایت دشوار نمونہ پیش کیا۔"

(۷) ایڈورڈ گبن لکھتا ہے :

"جب ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اپنی بیٹی عائشہؓ سے کہا کہ جدی جائیداد

---

[1] ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وظائفِ سابقون' لاحقون سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے فرمایا : سبقت الی الاسلام سے میں بھی واقف ہوں مگر یہ تو وہ چیز ہے جس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ یہاں اس دنیا میں تو معاش کا معاملہ ہے اور اس میں سابق اور لاحق سب برابر ہیں' یکسانیت ترجیح سے بہتر ہے۔

کا گوشوارہ مرتب کرلو تا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ ابو بکر نے بیت المال میں ناجائز تصرف کر کے جائداد میں اضافہ کرلیا ہے۔ وہ صرف تین درہم روزانہ اپنے خانگی اخراجات کے لئے لیتے تھے۔ صرف ایک اونٹ اور ایک حبشی غلام ان کی ملکیت تھا۔ اس کے باوجود ہر جمعہ کو وہ ذاتی پس ماندہ رقم اور بیت المال کی ساری رقم خیرات کر دیتے تھے۔ جب ان کی وفات کے بعد ان کا کل ترکہ جو ایک موٹے کرتے اور چادر اور پانچ درہم پر مشتمل تھا' عمرؓ کے حوالے کیا گیا تو انہوں نے آہ سرد بھر کر کہا "میں ان کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا۔"

(۸) ڈاکٹر وائل "A History of the Islamic Peoples" میں لکھتا ہے :

"ابو بکر کی نجی زندگی بھی اسی طرح پاکیزہ اور اعتراضات سے بالاتر تھی جس طرح ان کی پبلک زندگی۔ اس کے سوا ان پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہو سکتی کہ وہ خالدؓ پر غیر معمولی طور سے مہربان تھے' مگر یہ طرز عمل بھی ان کی سیاسی حکمت عملی اور دانش مندی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے مال غنیمت ہمیشہ صرف سلطنت کی بہبود پر خرچ کیا' خود کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ وہ خلیفہ ہو کر بھی اسی طرح غریب رہے جس طرح پہلے تھے۔ وہ اپنی ساری دولت اسلام پر قربان کر چکے تھے۔ انہوں نے صحابہ کے اصرار شدید پر چند ہزار درہم سالانہ بطور وظیفہ قبول کیا تھا۔ وہ مہربان' سادگی پسند اور بہت متورع تھے"۔

(۹) اندرے سرویئر (Andre Servier) لکھتا ہے :

(کتاب "Islam and the Psychology of the Musalmans")

"ابو بکر بہت سادگی پسند تھے اور خلیفہ بن جانے کے باوجود انہوں نے غربت کی زندگی بسر کی۔ جب وفات پائی تو ترکے میں صرف ایک بوسیدہ قمیص' ایک غلام اور ایک اونٹ چھوڑا۔ وہ حقیقی معنی میں اپنی قوم کے شیخ اور سردار تھے۔ اہل مدینہ کے محبوب تھے۔ ایک خوبی ان میں سب خوبیوں پر بھاری تھی اور وہ سخت جفاکشی تھی۔ ان کی فتوحات کا سرچشمہ وہ دو صفات تھیں جو ان کے دشمنوں میں نہیں تھیں۔ ایک تو ایمان باللہ جسے کوئی طاقت نہیں ہلا سکتی تھی' دوسری اسلام کی حقانیت پر پختہ یقین۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ صحیح مقام پر صحیح آدمی تھے۔ انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کام کو از سر نو شروع کر کے پایہ تکمیل

تک پہنچایا"۔

(۱۰) سر ولیم میور لکھتا ہے :

"جب ابو بکرؓ بستر مرگ پر تھے تو ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی کہ بیت المال سے بقدرِ ضرورت وظیفہ بھی کیوں لیا؟ لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ میری فلاں جائیداد بیچ کر وظیفے کی کل رقم بیت المال میں واپس کر دی جائے۔

سیرت کے اعتبار سے ابو بکر نہایت رقیق القلب اور شریف النفس تھے۔ اسی رقت قلبی کی بنا پر ان کا لقب "الاوّاہ" پڑ گیا تھا یعنی بہت زیادہ آہ بھرنے والا۔ انہوں نے ساری عمر کسی پر ظلم نہیں کیا۔ دن میں معاملات خلافت انجام دیتے تھے' رات کو غریبوں اور مسکینوں کی خفیہ طور پر خدمت کرتے تھے۔ ایک رات حضرت عمرؓ مدینے کی ایک ضعیف اور نابینا بیوہ کی خدمت کے لے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابو بکر ان سے پہلے پہنچ کر ان کی خدمت میں مشغول ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ابو بکر بہت نرم دل تھے مگر ضرورت کے وقت نہایت مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے تھے۔ مثلاً سب نے منع کیا مگر انہوں نے جیشِ اسامہ کو روانہ کر کے ہی دم لیا حالانکہ اس وقت مدینے میں فوج کی اشد ضرورت تھی۔ آنحضرتؐ کی اطاعت کا جذبہ اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے سب صحابہ سے کہہ دیا کہ جس علم کو آنحضرت نے لہرا دیا میں اس کو ہرگز نہیں لپیٹوں گا۔

ابو بکر کو استعلائے نفس کا خیال مطلق نہ تھا' اگرچہ وہ مطلق العنان تھے مگر انہوں نے اپنے اقتدار کو اسلام کی بہبود کے لئے استعمال کیا۔ لیکن ان کی غیر معمولی قوت کار از محمد (ﷺ) پر ایمان میں مضمر تھا۔ ان کے سامنے ہمیشہ ایک ہی مسئلہ رہتا تھا اور وہ یہ کہ اس معاملے میں جو اس وقت میرے سامنے ہے اگر آنحضرتؐ ہوتے تو کیا کرتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس اصول سے وہ بال برابر اِدھر یا اُدھر نہیں ہوئے۔ اسی جذبے کی بدولت وہ فتنہ ارتداد کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور اسلام کی بنیادوں کو دوبارہ مستحکم کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ ان کا عہد حکومت بہت مختصر تھا مگر پیغمبر کے بعد' دین اسلام اپنی بقا کے لئے ان سے زیادہ کسی شخص کا ممنونِ احسان نہیں ہے۔

ان کا محمد (ﷺ) پر ایسا پختہ ایمان خود محمد (ﷺ) کے خلوص پر زبردست شہادت ہے۔ اگر محمد (ﷺ) نے اپنی نبوت کا آغاز فریب سے کیا ہوتا تو وہ اس شخص (یعنی ابوبکر) کی حمایت اور دوستی اور رفاقت حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے جو انتہائی دانش مند اور زیرک ہی نہیں تھا بلکہ جس نے اپنی ساری زندگی ایمانداری' خلوص اور سادگی میں بسر کردی"۔

(The Caliphate byW.MuirP.78–81)

(۱۱) سائیکلوپیڈیا بریطانیکا جلد اول صفحہ ۶۹ :

"چونکہ ابوبکرؓ کا ایمان محمد (ﷺ) کی رسالت پر نہایت پختہ اور مستحکم تھا اس لئے انہیں الصِدیق کا لقب حاصل ہو گیا۔ رسول سے شخصی تعلق میں انہوں نے انتہائی ندویت اور سچی عقیدت کا ثبوت دیا۔ ان کا ایمان غیر متزلزل تھا۔ بوقت ہجرت صرف وہی رفیق پیغمبر تھے اور رفاقت کا یہ شرف انہیں پیغمبر کی وفات تک مسلسل حاصل رہا۔

بحالتِ مرض الموت پیغمبرؐ نے ابوبکر کو امامتِ صلوٰۃ کا حکم دے کر دراصل اس طرف اشارہ کر دیا کہ میری وفات کے بعد وہی میرے جانشین ہوں گے۔ پیغمبرؐ کے اس انتخاب کی تصدیق تمام اکابر صحابہ نے کر دی' پھر انجام کار اس انتخاب کو مستقل حیثیت دے دی۔ اگرچہ علیؓ نے شروع میں اختلاف کیا تھا مگر پھر سرِ تسلیم خم کر دیا"۔

بقیہ : تعارفِ قرآن کریم

محارِمُہ "یعنی جس نے قرآن کی حرام کردہ اشیاء کو حلال ٹھہرالیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں ہے۔ اب اپنی زندگیوں کا جائزہ لیجئے' اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھئے۔ خود قرآن تم سے سوال کر رہا ہے کہ کیا تم نے اپنا نصیب یہ قرار دیا ہے کہ اسے جھٹلا رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے کہ ہم قرآن کی نہ قولی تکذیب کریں نہ عملی تکذیب۔ قول سے' عمل سے اس کی تصویب کریں۔ اللہ تعالیٰ اس پر ایمان اور یقین سے ہمارے سینوں کو منور کر دے۔ آمین!

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم۔ ونفعنی وایاکم بالایت والذکر الحکیم OO

امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ

تحریر : عبدالرشید عراقی

(گزشتہ سے پیوستہ)

تصانیف

امام بخاری کی تمام تصنیفات ایک علمی و تحقیقی ذخیرہ ہیں۔ ان کی مجمل فہرست یہ ہے :

(۱) الجامع الصحیح (صحیح البخاری) (۲) الادب المفرد (۳) التاریخ الکبیر (۴) التاریخ الاوسط (۵) التاریخ الصغیر (۶) خلق افعال العباد (۷) جزء رفع الیدین (۸) قراءۃ خلف الامام (۹) بر الوالدین (۱۰) کتاب الضعفاء (۱۱) الجامع الکبیر (۱۲) التفسیر الکبیر (۱۳) کتاب الاشربہ (۱۴) کتاب الھبہ (۱۵) کتاب المبسوط (۱۶) کتاب الکنی (۱۷) کتاب العلل (۱۸) کتاب الفوائد (۱۹) کتاب المناقب (۲۰) اسامی الصحابہ (۲۱) کتاب الوحدان (۲۲) قضایاالصحابہ والتابعین (۲۳) کتاب الرقاق{۱۶}

امام بخاری کی وفات

امام بخاری کو حاکم بخارا خالد بن احمد ذہلی نے اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپ میرے بچوں کو گھر آکر درس دیا کریں۔ امام صاحب نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا' آپ اپنے بچوں کو میرے درس میں بھیجا کریں۔ حاکم بخارا نے دوبارہ آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اس طرح کرلیں کہ جب میرے بچے آپ سے سبق پڑھیں تو کوئی دوسرا طالب علم وہاں موجود نہ ہو۔ امام صاحب نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا' سب طالب علموں کے ساتھ آپ کے بچے بھی درس لیں۔ حاکم بخارا نے اس کو اپنی توہین سمجھا اور آپ کے خلاف ہو گیا۔ چنانچہ اس نے آپ کے خلاف سازش کی اور آپ پر یہ الزام لگایا کہ آپ قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں' چنانچہ اس غلط الزام کی تشہیر کی گئی اور بخارا میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حاکم

بخارا نے آپ کی جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ امام صاحب بخارا سے نکل کر سمرقند پہنچے۔ یہاں آپ نے شوال ۲۵۶ھ چاند رات انتقال کیا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ۶۲ سال تھی۔ {۱۷}

صحیح بخاری

امام بخاری کی تصنیفات میں الجامع الصحیح یعنی صحیح بخاری سب سے مہتم بالشان تصنیف ہے۔ اس کتاب کا پورا نام "الجامع المسند الصحیح من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" ہے۔ اس کتاب کی تصنیف سے امام بخاری کو امام المحدثین اور امیر المومنین فی الحدیث کے القاب دیئے گئے۔ اور اس تصنیف سے امام صاحب کو جو مقبولیت اور قدر و منزلت ملی ہے وہ کسی اور محدث اور امام کو ان کو اپنی کسی تصنیف سے حاصل نہیں ہوئی۔ امام صاحب نے یہ مقدس کتاب ۱۶ سال میں مکمل کی اور جس وقت امام صاحب نے اس کتاب کی تالیف کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔ {۱۸}

صحیح بخاری کی تالیف میں اہتمام

امام بخاری نے اس کتاب کی تالیف میں ۱۹ سال صرف کئے۔ اور اس کو مسجد حرام میں تصنیف کیا۔ اس مبارک کتاب کو آپ نے ۶ لاکھ احادیث سے انتخاب کیا۔ {۱۹}

صحیح بخاری کی مقبولیت

صحیح بخاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ

> "کتاب اللہ کے بعد ان دونوں کتابوں (بخاری و مسلم) کا درجہ ہے۔ پھر صحیح بخاری کا مرتبہ صحت اور کثرتِ فوائد کے لحاظ سے ممتاز و مقدم ہے"۔ {۲۰}

اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص اس کتاب کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ مبتدع ہے اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے"۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قسم کھا

کر فرماتے ہیں کہ صحیح بخاری کو جو مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ {۲۱}

صحیح بخاری کا مقصد و مقصودِ اعظم

صحیح بخاری صرف حدیث ہی کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں تفسیر بھی ہے' فقہ و استدلال کے عمدہ نمونے بھی ہیں اور دقیق متکلمانہ بصیرت بھی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :

"امام بخاری نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے اور اس میں صرف احادیث صحیحہ لائے ہیں اور اس کے ساتھ فقہی مسائل اور حکیمانہ نکتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ متون احادیث سے بہت سے معانی استنباط فرماتے ہیں' جو مناسب طریقہ سے پوری کتاب میں موجود ہیں' آیات احکام کی طرف پوری توجہ دیتے ہیں اور اس میں عجیب و غریب معانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں"۔ {۲۲}

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ

"امام بخاری کی اصل غرض و غایت احادیث کے ذخیرے میں سے صحیح و مستفیض و متصل کا انتخاب ہے اور فقہ و سیرت اور تفسیر کو بھی استنباط کیا ہے۔ اور اخذ حدیث میں انہوں نے جو شرائط مقرر کی ہیں وہ بدرجہ کمال پوری کی ہیں"۔ {۲۳}

کتب احادیث میں صحیح بخاری کا مرتبہ و مقام

جمہور علمائے حدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحیح بخاری کو صحاح ستہ اور تمام کتب احادیث پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ صحیح بخاری صحت اور دیگر شواہد کے لحاظ سے صحیح مسلم پر فائق ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ صحیح بخاری کا صحیح مسلم یا کوئی اور کتاب مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بخاری و مسلم اور موطا امام مالک کی احادیث نہایت صحیح ہیں اور موطا کی اکثر روایات مرفوعہ صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ امام دار قطنی فرماتے ہیں : اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم کا وجود نہ ہوتا۔ {۲۴}

تعداد روایات

علامہ نووی اور ابن صلاح کے نزدیک صحیح بخاری کی روایات کی تعداد تکرار کے ساتھ ۷۲۷۵ ہے اور عدم تکرار کے ساتھ ۴۰۰۰۔ اور حافظ ابن حجر کے نزدیک روایات مرفوعہ کی تعداد ۷۳۹۷ ہے' متابعات و تعلیقات کی تعداد ۱۳۴۱ ہے' موقوفات صحابہ و مقطوعات تابعین کی تعداد ۳۴۱ ہے۔ {۲۵}

صحیح بخاری کے حواشی و شروح

صحیح بخاری کی اہمیت و مقبولیت کی بناپر ہر دور کے علماء نے اس کے شروح و حواشی لکھے اور اس سے صحیح بخاری کے جلیل القدر اور بلند پایہ ہونے کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ صحیح بخاری کی شروح کی ایک فہرست مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے اپنی کتاب سیرۃ البخاری میں درج کی ہے' جس کی تعداد ۱۴۵ ہے اور یہ فہرست بھی نامکمل ہے۔ تاہم صحیح بخاری کی مشہور شروح حسب ذیل ہیں :

(۱) فتح الباری' شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی
(۲) عمدۃ القاری' علامہ بدرالدین عینی
(۳) ارشاد الساری' علامہ احمد بن محمد خطیب قسطلانی
(۴) عون الباری' محی السنۃ مولانا نواب صدیق حسن خان قنوجی
(۵) فیض الباری' مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری
(۶) تیسیر الباری' مولانا وحید الزمان حیدر آبادی
(۷) فضل الباری' مولانا ابوالحسن محمد سیالکوٹی
(۸) حاشیہ صحیح بخاری' مولانا احمد علی سہارن پوری
(۹) حاشیہ صحیح بخاری' مولانا عزیز زبیدی

مختصر تعارف فتح الباری

فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے۔ اور اس شرح کے بارے میں مشہور مقولہ "لا ھجرۃ بعد الفتح" بولا جاتا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بخاری

کی شرح کا دَین (قرض) امت پر باقی ہے' حالانکہ علامہ ابن خلدون کے عہد تک کئی شروح بخاری کے کئے جا چکے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ صحیح بخاری کے وہ نکات جو فنِ حدیث اور رجال کے متعلق ہیں یا وہ تدقیقاتِ فقیہ جو تراجم ابواب سے تعلق رکھتے ہیں ان پر آج تک کسی نے محققانہ بحث نہیں کی۔ اس شرح کے بعد حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری لکھ کر امت پر جو قرض تھا وہ ادا کر دیا ہے۔

فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے ان نکات پر جو فن رجال یا تراجم ابواب کی تدقیقات سے متعلق ہیں محققانہ بحث کی ہے اور حدیث کے مختلف طرق کو جمع کیا ہے جس سے حدیث کے کسی ایک احتمال یا اعراب کی تعیین ہو جاتی ہے۔ اور کسی نے یہ صحیح کہا ہے کہ "کل من جاء بعدہٗ فھو عیالہٗ" یعنی جو بھی ان کے بعد آیا انہی کی تحقیقات کا خوشہ چیں رہا۔ {۲۶}

حواشی

{۱۶} ضیاء الدین اصلاحی' تذکرۃ المحدثین' ج ۱' ص ۲۱۲

{۱۷} ابن حجر۔ مقدمہ فتح الباری' ص ۴۹۴

{۱۸} ابن خلکان۔ وفیات الاعیان' ج ۲' ص ۳۳۵

{۱۹} عبد السلام مبارکپوری' سیرۃ البخاری' ص ۱۸۶

{۲۰} ابن صلاح' مقدمہ ابن صلاح

{۲۱} شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' ج ۱' ص ۲۹۷

{۲۲} ابن حجر۔ مقدمہ فتح الباری' ص ۴۹۳

{۲۳} شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' ج ۲' ص ۲۱۵

{۲۴} نووی' مقدمہ شرح صحیح مسلم' ص ۱۱۔ ابن کثیر' البدایہ والنہایہ' ج ۱۱' ص ۲۸۔ شاہ عبد العزیز دہلوی' عجالہ نافعہ' ص ۶۔ شبیر احمد عثمانی' مقدمہ فتح الملہم

{۲۵} سیوطی' تدریب الراوی' ص ۳۰۔ ابن حجر' مقدمہ فتح الباری' ص ۴۶۵

{۲۶} عبد السلام مبارکپوری' سیرۃ البخاری' ص ۲۰۵۔ ابن خلدون' مقدمہ ابن خلدون۔ حافظ سخاوی' الضوء اللامع' ص ۱۲۔ خطیب قسطلانی' ارشاد الساری' ص ۳۶

رمضان المبارک کے دوران
قرآن اکیڈمی کراچی کے شب و روز

——— ایس۔ایم۔انعام ———

یہ بات تمام منتظمین اور نمازیوں کے لئے باعث مسرت تھی کہ قرآن اکیڈمی کراچی کی اصل مسجد جامع القرآن میں پنج وقتہ نمازوں کا آغاز ۹ فروری ۹۶ء (بمطابق ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ) سے ہو گیا۔ اس سے قبل مسجد کی تعمیر کا کام مکمل نہ ہونے کے سبب اکیڈمی کے بیسمنٹ (basement) میں نمازیں ادا کی جارہی تھیں۔ بیسمنٹ میں نمازوں کا آغاز ۱۹۹۱ء میں انجمن خدام القرآن سندھ کے نگران محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطابِ جمعہ اور دورۂ ترجمہ قرآن سے ہوا تھا۔ مسجد کے اپنی جگہ پر منتقل ہو جانے کے بعد اب بیسمنٹ کو ان شاء اللہ انجمن کے بنیادی مقصد یعنی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ مسجد کے افتتاح والے روز اراکین مجلس منتظمہ کے چہرے خوشی سے تمتمارہے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا اس روز اللہ تعالیٰ نے ان کی دیرینہ آرزو جو پوری کی تھی۔ خطاب جمعہ سننے کے دوران میری نگاہیں مسجد کے در و دیوار کا جائزہ لینے لگیں۔ ۱۱۱×۶۲ فٹ کا کشادہ ہال' بغیر ستونوں کے اتنا وسیع رقبہ کراچی میں شاید ہی کسی مسجد کا ہو۔ میرا ذہن ماضی کی طرف منتقل ہوا۔ آج سے دس سال قبل اللہ کی کتاب کی ہر شعبہ زندگی میں فرمانروائی چاہنے والے انسانوں کے لئے کراچی میں شاید ہی کوئی ٹھکانہ تھا اور اب کراچی کے کونے کونے سے خواتین و حضرات قرآن و حدیث پر مبنی خطبات جمعہ سننے' تربیت گاہوں میں شرکت اور عربی زبان سیکھنے کے لئے کھنچے چلے آرہے تھے۔ اعجاز لطیف صاحب نماز جمعہ کے بعد بڑی عاجزی و دلسوزی کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ جن جن حضرات نے دامے درمے سخنے تیرے اس گھر کو' اس سادہ مگر

پروقار مسجد کو بنانے' سنوارنے میں حصہ لیا ہے تو ان سب کی کوششوں کو قبول فرما اور ان کی مساعی کو ان کے لئے توشہ آخرت بنا اور جب تک تیرے اس گھر میں تیری کبریائی کا اعلان ہوتا رہے' تیری آخری کتاب کا پڑھنا پڑھانا' سیکھنا اور سکھانا ہوتا رہے' جو جو نیک عمل یہاں ہوتا رہے ان سب کا اجر اس گھر کو آباد کرنے والوں کو ابدالاباد تک دیتے رہنا۔ انک لاتخلف المیعاد

مئی ۸۶ء میں انجمن سندھ کی تاسیس کے بعد سے ہی اس کے پہلے صدر محترم سراج الحق سید صاحب کی سرکردگی میں قرآن اکیڈمی کے لئے ایک قطعہ زمین کی تلاش ہوئی۔ راجہ محمد ارشاد صاحب اور عبدالمجید شیخ صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے ڈیفنس اتھارٹی نے درخشاں میں اکیڈمی کے لئے تین ہزار مربع گز زمین الاٹ کی اور تعمیر کا آغاز ہوگیا۔ محترم سراج الحق سید صاحب کے لاہور شفٹ ہونے کے بعد ۶ سال تک صدارت کا بارگراں جناب زین العابدین صاحب کے کاندھوں پر رہا۔ تعمیر کا بیشتر کام ان کے دور میں مکمل ہوا لیکن finishing ابھی باقی تھی جس کی وجہ سے اصل مسجد میں نماز ادا نہیں ہو رہی تھی جس کے لئے اب بھی خطیر رقم درکار تھی۔ انجمن کے موجودہ صدر جناب عبداللطیف عقیلی صاحب نے اکتوبر ۹۵ء میں چارج سنبھالنے کے بعد نماز کی ادائیگی اصل مسجد میں کرنے کو اولین ترجیح دی اور الحمدللہ اعتکاف شروع ہونے سے ایک دن قبل نماز کی باقاعدہ ادائیگی مسجد میں شروع ہوگئی' جبکہ وسائل اور افرادی قوت کی کمی اور کام کی کثرت کے باعث ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

اگلے دن یعنی ۲۰ رمضان المبارک عصر کے بعد سے مغرب تک اس مسجد میں اعتکاف کے خواہشمند حضرات کی آمد شروع ہوگئی جن کو انتظامیہ نے اخبارات میں اشتہارات دے کر مدعو کیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے معتکفین کی تعداد ۶۵ تک پہنچ گئی۔ معتکفین کے لئے سحری و افطاری کا انتظام انجمن کی طرف سے تھا۔ اس کار خیر میں معتکف حضرات بھی دامے درمے شریک ہوئے۔ معتکفین کے لئے بنائے جانے والے حجروں کی بناوٹ سادگی اور حسن کارکردگی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ معتکفین کے لئے تربیت کا ایک خاص پروگرام ترتیب دیا گیا اور اس کو ترتیب دینے میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ ان کو خلوت

میں عبادت کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے' البتہ اس تربیت کا اہم پروگرام تھا رات میں دورۂ ترجمہ قرآن' یعنی ہر چار رکعت تراویح میں سنائی جانے والی آیاتِ کریمہ کا ترجمہ مع تفسیر' جس کا مقصد قرآن حکیم کا سمجھنا اور پھر اس سے عملی لگاؤ پیدا کرنا ہے۔ یہ سعادت گزشتہ چار سالوں سے قرآن اکیڈمی کامرس کالج کے پرنسپل انجینئر نوید احمد صاحب کے حصے میں آرہی ہے اور الحمدللہ انہوں نے اسے اس مرتبہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ عام راتوں میں تقریباً ۸۰ مردوں اور ۲۵ خواتین کے دلوں کو وہ قرآن حکیم کی آیات سے گرماتے رہے' جبکہ تعطیل والے دنوں میں یہ تعداد دوگنا ہو جاتی رہی۔ ستائیسویں شب میں تقریباً ۴۰۰ مرد اور ۱۰۰ خواتین حاضر تھیں۔ اس روز ختم قرآن کے بعد شیرینی کے علاوہ امام حرم شریف کی قراءت کی آڈیو کیسٹ بھی شرکاء کو تحفہ کے طور پر پیش کی گئی۔

معتکفین کی تجوید درست کرنے کے لئے فجر کی نماز کے بعد آدھ گھنٹے کا ایک خصوصی پروگرام بھی کیا جاتا رہا جس کے استاذ مسجد جامع القرآن کے پیش امام محمد ریاض تبسم صاحب تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد قریباً ایک گھنٹہ نوید احمد صاحب دورۂ ترجمہ قرآن کے شرکاء کی تشنگی دور کرنے کے لئے ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات دیتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد انجمن کے ناظم مالیات اور تنظیم اسلامی حلقہ سندھ و بلوچستان کے ناظم جناب نسیم الدین صاحب نے چند مخصوص عنوانات پر گفتگو کی۔ مثلاً عام فقہی معلومات' ذکر آخرت' عبادت کیوں؟' فرائض دینی کا جامع تصور وغیرہ اور پھر آخری روزے کی نماز عصر کے بعد یعنی اعتکاف ختم ہونے سے قریباً ایک گھنٹہ قبل ان کا خطاب اور پروگرام انتہائی جاندار اور پراثر تھا۔ اس دوران انہوں نے معتکفین کو یاد دہانی کرائی کہ وہ یہاں سے جو جذبہ لے کر جا رہے ہیں اسے ہر قیمت پر برقرار رکھیں اور ان کے حق کی راہ کو اختیار کرنے کے باعث بے دین معاشرے کا جو ردعمل ان کے خلاف ہو اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں' لیکن باطل کے آگے سرنگوں نہ ہوں۔ انہوں نے معتکفین سے باقاعدہ عہد لیا کہ وہ اپنی ذات پر' اپنے گھر بار پر اور جہاں جہاں ان کا بس چلتا ہے اللہ کے دین کو نافذ کریں گے' منکرات کو' فحاشی و عریانی اور سودی کاروباری کو ختم کریں گے۔ اس جدوجہد کو جاری رکھیں گے جس کا سبق اس دس روزہ تربیت گاہ کے دوران انہوں نے سیکھا ہے۔ اس کے

بعد انہوں نے نہایت الحاح و زاری سے بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ دعا کیا تھی' اقبال کے اس مصرع کی صداقت کا مظہر تھی ع... دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ وہ دعا کر رہے تھے' جواب میں آمین کہنے کی بجائے لوگوں کی سسکیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ پورے ماحول پر دل گرفتگی کی کیفیت طاری تھی۔ لوگ ماضی کی غلطیوں کو یاد کر کر کے عرق انفعال سے اپنے چہروں کو دھو رہے تھے اور ایک عزم تازہ کے ساتھ یہ دعا کر رہے تھے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً' اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ! رمضان کی آخری ساعتیں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ میں بھی اس دعا میں شامل تھا کہ اے اللہ اس گھڑی کو ہمارے لئے قبولیت کی گھڑی بنا اور اپنے دین کو ہم پر اور معاشرے پر مکمل غلبہ عطا فرما۔ آخر میں صدر انجمن محترم عبداللطیف عقیلی صاحب نے (جو بذات خود بھی معتکفین میں سے تھے) شرکاء کی خدمت میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی چار کتابوں یعنی راہ نجات' دعوت الی اللہ' حب رسول اور تنظیم اسلامی کی دعوت کا تحفہ پیش کیا۔

کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- از روئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کونسی ہیں؟
- نیکی' تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے؟

تو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے جاری کردہ

مندرجہ ذیل خط و کتابت کورسز سے فائدہ اٹھایئے:

۱۔ قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس ۲۔ عربی گرائمر کورس (I,II)

۳۔ ترجمہ قرآن کریم کورس (پرائمری پاس بچے اور معمولی خواندہ حضرات بھی استفادہ کر سکتے ہیں)

مزید تفصیلات اور فری پراسپکٹس کے حصول کے لئے رابطہ کیجئے

شعبہ خط و کتابت کورسز

۱۹۱۔اے' اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور فون ۸۔۵۸۳۳۶۳

سالانہ رپورٹ
شعبہ خط و کتابت کورسز
برائے سال ۱۹۹۵ء

مرتب : انوار الحق چوہدری، ناظم شعبہ

۱۔ شعبے کا اجراء

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر موسس انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی کی دعوت "رجوع الی القرآن" کی متعدد جہتیں (Facets) ہیں۔ عوام کے لئے ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآن اور خطبات جمعہ، قرآن کالج میں نوجوان طلبہ کے لئے یونیورسٹی کورسز یعنی ایف۔اے، بی۔اے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم یعنی عربی گرامر، قرآن اور حدیث کی تعلیم، عمر رسیدہ اور Serving احباب کے لئے عربی گرامر اور قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک سالہ کورس، تجوید سیکھنے کے لئے سپیشل کلاسز، بچوں کے حفظ قرآن کے لئے جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں شعبہ حفظ قرآن وغیرہ۔

ان سب کے علاوہ ایسے طلبہ و طالبات، خواتین و حضرات جو ملک سے یا لاہور سے باہر ہیں یا جن کے لئے کسی وجہ سے قرآن کالج/قرآن اکیڈمی لاہور میں حاضری ممکن نہیں، خط و کتابت کورسز ترتیب دیئے گئے ہیں، تاکہ سب گھر بیٹھے بیٹھے سہولت کے ساتھ اپنے فارغ وقت میں عربی گرامر اور قرآن کی تعلیم حاصل کر سکیں اور درج ذیل کورسز سے استفادہ کر سکیں :

(i) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی
(ii) ابتدائی عربی گرامر (حصہ اول)
(iii) ابتدائی عربی گرامر (حصہ دوم)

پہلے کورس کا آغاز جنوری ۱۹۸۸ء میں کیا گیا۔ اس کورس کا مقصد خواتین و حضرات اور

طلبہ و طالبات کو قرآن حکیم کے مربوط مطالعے کے ذریعے دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور سے متعارف کرانا ہے۔ بفضل باری تعالیٰ یہ کورس خوب زور و شور سے جاری ہے۔ اس میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۱۹۲۰ تک پہنچ چکی ہے۔ بیرون ملک سے اس کورس کا اجراء سعودی عرب میں جدہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض، دہران اور الواسیع میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ابوظبی، دوبئی، شارجہ، راس الخیمہ، انگلینڈ، فرانس، کینیڈا اور امریکہ میں بھی اس کورس کا اجراء ہو چکا ہے۔

دوسرے کورس (حصہ اول) کا اجراء نومبر ۱۹۹۰ء میں کیا گیا۔ قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کے لئے ابتدائی عربی گرائمر کا جاننا ناگزیر ہے۔ اس کورس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو عربی گرائمر کے بنیادی اصولوں سے اس حد تک متعارف کرا دیا جائے کہ قرآن اور حدیث سے براہ راست استفادہ کے لئے انہیں ایک بنیاد حاصل ہو جائے۔ اول الذکر کورس کی طرح یہ کورس بھی بہت مقبول ہوا۔ اس کے طلبہ اور طالبات کی تعداد ۱۱۵۹ تک پہنچ چکی ہے۔ یہ کورس بھی بیرون پاکستان سعودی عربیہ، ابوظبی، دوبئی، شارجہ، انگلینڈ، فرانس، کینیڈا اور امریکہ میں جاری ہو چکا ہے۔

اس کورس کے حصہ دوم کا آغاز بھی اکتوبر ۱۹۹۲ء میں کر دیا گیا تھا۔ اس میں طلبہ کی تعداد ۱۱۵ تک پہنچ چکی ہے۔

۲۔ ان کورسز کو متعارف کرانے کے لئے اقدام

سال رواں ۱۹۹۵ء کے دوران ان دونوں کورسز کو بڑے پیمانہ پر متعارف کرانے کے لئے مندرجہ ذیل اقدام کئے گئے:

۱۔ انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے اپنے ماہانہ جرائد یعنی "حکمت قرآن" اور "میثاق" میں وقفہ وقفہ سے ان کورسز کے اشتہارات جاری کئے گئے۔

۲۔ ان کورسز کو پبلک میں متعارف کرانے کے لئے روزنامہ نوائے وقت اور جنگ میں سال میں دو دفعہ اشتہارات دیئے گئے۔

۳۔ تنظیم اسلامی کے ۲۳ اسرہ جات کے نقباء اور ۷ امراء کو ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

نے ذاتی خط لکھے کہ وہ اپنے اپنے شہروں میں ان کورسز کو پبلک میں متعارف کرائیں۔ انہیں ان کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی مندرجہ ذیل شہروں، ملکوں میں ارسال کئے گئے۔

اندرون ملک : کراچی، کوئٹہ، ملتان، فیصل آباد، لاہور، گجرات، راولپنڈی، اسلام آباد، پشاور، سکھر، چکوال، سرگودھا، شجاع آباد، وہاڑی، بورے والا، بہاولپور، رحیم یار خان، میرپور خاص۔

بیرون ملک : ۱۔ سعودی عرب میں مکہ مکرمہ، جدہ، مدینہ منورہ، ریاض، داہران، الواسیع ۲۔ ابوظبی، ۳۔ دوبئی، ۴۔ شارجہ، ۵۔ راس الخیمہ ۶۔ انگلینڈ، ۷۔ فرانس، ۸۔ کینیڈا، ۹۔ امریکہ

ان نقباء اور اسرہ جات کو ہر چھ ماہ کے بعد یاد دہانی کرائی گئی۔ اور پراگریس رپورٹیں بھی منگوائی گئیں۔

۴۔ ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز نے اپنے احباب اور ہم خیال دوستوں کو ان کورسز سے متعارف کرانے کے لئے ذاتی خطوط بھی تحریر کئے۔

۵۔ لاہور کی مندرجہ ذیل بڑی بڑی لائبریریوں کے انچارجز کو ان کورسز کے بارے میں خط لکھے گئے۔ ان سے استدعا کی گئی کہ ان کورسز کے اشتہارات اپنی لائبریریوں کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کئے جائیں۔ انہیں اشتہارات، کورسز کے پراسپکٹس اور داخلہ فارمز بھی بھجوائے گئے :

(ا) پنجاب پبلک لائبریری
(ب) پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور
(ج) دار السلام لائبریری باغ جناح لاہور
(د) قرآن محل، پنجاب پبلک لائبریری لاہور

۳ ۔ موازنہ

۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء کے موازنہ کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں :

	۱۹۹۴ء	۱۹۹۵ء	اضافہ
(۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس			
(ا) دوران سال داخلے لینے والوں کی تعداد	۳۵۷	۵۰۹	٪ ۴۲.۶
(ب) دوران سال کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۵۱	۶۹	٪ ۳۵.۳
(ج) کورس شروع ہونے کے وقت طلبہ / طالبات کی تعداد	۱۰۶۳	۱۵۷۲	٪ ۴۷.۹
(۲) عربی گرامر کورس (حصہ اول)			
(ا) دوران سال داخلہ لینے والوں کی تعداد	۲۶۲	۲۹۱	٪ ۱۱۱.۱
(ب) کورس مکمل کرنے والوں کی تعداد	۴۱	۴۷	٪ ۱۴.۶
(ج) کورس شروع ہونے کے وقت طلبہ و طالبات کی تعداد	۸۶۸	۱۱۵۹	٪ ۳۳.۵
عربی گرائمر (حصہ دوم)			
(ا) داخلہ لینے والوں کی تعداد	۳۶	۴۵	٪ ۲۵
(ب) پاس ہونے والوں کی تعداد	۱۵	۳۰	٪ ۱۰۰

۴ ۔ تقابلی موازنہ سے معلوم ہو گا کہ سال رواں ۱۹۹۵ء میں پچھلے سال ۱۹۹۴ء کے مقابلہ میں ان کورسز میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ کورس نمبر ا کے اضافہ کی شرح ۴۲.۶ فیصد رہی۔ جبکہ کورس نمبر ۲ عربی گرائمر میں اضافہ کی شرح ۱۱۱.۱ فیصد رہی۔

یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ بفضل باری تعالیٰ سال رواں ۱۹۹۵ء میں شعبہ خط و کتابت کورسز کی کارکردگی بہت بہتر رہی۔

سُورۃ البقرۃ

آیات ۸۰۔۸۲

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغہ 'الاعراب' الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبرا کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۵۰ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ
اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ
تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ
سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

۲:۵۰:۱ اللغـــة

[وَقَالُوا] جس کا ترجمہ "اور انہوں نے کہا" بنتا ہے۔ مگر یہاں "یہود کے کردار اور ان کے عقائد" کی بات چل رہی ہے۔ اس لیے سیاق عبارت میں اس کا ترجمہ ماضی کی بجائے حال کے ساتھ کیا جا سکتا ہے یعنی "اور وہ کہتے ہیں"۔ "قالوا" (جو فعل ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے) کے مادہ، وزن، باب فعل اور معنی وغیرہ پہلے کئی دفعہ گزر چکے ہیں مثلاً دیکھئے البقرہ: ۱۱ [۲:۹:۱(۴)]

۲:۵۰:۱(۱) [لَنْ تَمَسَّنَا] یہ فعل مضارع منصوب منفی بلَن "لَنْ تَمَسَّ" کے ساتھ ضمیر منصوب متصل "نا" (یعنی ہم کو) کا مرکب ہے اور "لَنْ تَمَسَّ" کا مادہ "م س س" اور وزن (پورے صیغے کا) "لَنْ تَفْعَلَ" ہے یعنی یہ دراصل "لَنْ تَمْسَسَ" تھا۔ پھر دونوں سین مدغم ہو گئے۔

● فعل مجرد اس مادہ سے "مَسَّ .... یَمَسُّ (دراصل مَسِسَ یَمْسَسُ) مَسًّا (سمع سے) سے آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: "... کو چھونا (ہاتھ وغیرہ سے)"، "... کو ہاتھ لگانا" جیسے "لا یمسّہ الاّ المطھرونَ" (الواقعۃ: ۷۹) میں ہے کہ "اسے نہیں ہاتھ لگاتے/چھوتے مگر باطہارت لوگ"۔ "مَسّ" میں زور اور شدت (سے چھونے) کا ــــ یعنی "چپک جانے" کا مفہوم ہوتا ہے (جیسے "لَمس" میں ہلکے سے "چھونا" کا مفہوم ہوتا ہے) پھر مجازاً اور استعارہ میں "آلگنا، آپکڑنا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے (یعنی جو دکھ یا سکھ انسان کو پہنچے) جیسے "مَسَّنِیَ الکِبَرُ" (الحجر: ۵۴) میں ہے یعنی "مجھ کو آلگا بڑھاپا"۔ اسی طرح "اِذا مسّہُ الشرُّ" اور "اذا مسّہ الخیر" (المعارج: ۲۰-۲۱) میں ہے (جب اس کو دکھ پہنچتا ہے/ جب اس کو بھلائی پہنچتی ہے) قرآن کریم میں اس کا زیادہ استعمال برائی، دکھ، عذاب، شر، آگ تھکاوٹ، سختی وغیرہ کے ساتھ ہوا ہے۔ اگرچہ بھلائی (خیر، حسنۃ، سرّاء) کے ساتھ بھی آیا ہے مگر کم۔ اور کبھی یہ فعل بطور استعارہ مرد و عورت کے جنسی تعلق قائم ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے کہتے ہیں "مَسَّ المرأۃَ" (اس نے عورت کو چھوا یعنی اس سے جنسی تعلق رکھا) اور اسی معنی میں قرآن کریم میں ہے "لم یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ" (مریم: ۲۰) یعنی "مجھے کسی آدمی نے ہاتھ نہیں لگایا) اور "مِنْ قبلِ ان تَمَسُّوْھن" (الاحزاب: ۴۹) یعنی رخصتی سے پہلے" اور "مَسّ الشیطان (شیطان کا آلگنا) "پاگل پن" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے ساٹھ کے قریب مقامات پر آئے ہیں اور باب تفاعل سے صرف ایک صیغہ دو جگہ آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے مشتق و ماخوذ کلمات بھی دو تین جگہ وارد ہوتے ہیں۔

● "لن تَمَسَّنا" میں فعل "لن تمسّ" کا صیغہ واحد مؤنث ہے کیونکہ اس کا فاعل "النار" (جو آگے آرہا ہے) مؤنث سماعی ہے۔ اس طرح "لن تمسنا" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "ہرگز نہ چھوئے گی ہم کو"۔ جسے بعض نے

"ہم کو ہرگز نہ لگے گی (یعنی آگ جس کا آگے ذکر آرہا ہے) سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے "ہمیں تو نہ چھوتے گی" سے ترجمہ کیا ہے جس میں "نفی جحد بلن" (زور سے نفی کرنا) کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بعض نے اس "نفی بجحد" (زور سے انکار) کے مفہوم کی بنا پر ترجمہ "ہم کو تو چھوئے گی بھی نہیں" سے کیا ہے۔ جو اچھا ترجمہ ہے۔

[النَّارُ] کا مادہ "ن ور" اور وزن اصلی (لام تعریف نکال کر) "فَعَلٌ" ہے یہ دراصل "نَوَرٌ" تھا جس میں "واو متحرک ماقبل مفتوح" الف میں بدل کر لکھی اور بولی جاتی ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کے علاوہ خود اسی لفظ (النار) کے بارے میں البقرہ: ۱۷ [۲: ۱۳: ۱ (۳)] میں بات ہو چکی ہے۔ "النار" کے لفظی معنی تو "آگ" ہی ہیں تاہم لام تعریف کی بناء پر یہاں کوئی "خاص آگ" مراد ہے۔ اس لیے بیشتر مترجمین نے یہاں صرف آگ کی بجائے "دوزخ کی آگ" کی صورت میں تفسیری ترجمہ کیا ہے۔

[اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً] کا ابتدائی "اِلا" حرف استثناء (بمعنی مگر، سوائے، بجز) ہے۔ یہاں (زیر مطالعہ عبارت) میں اس کے "عمل" پر حصہ "الاعراب" میں بات ہوگی۔

"اَيَّامٌ" (جو یہاں منصوب "اَيَّامًا" آیا ہے اس کی نصب پر بھی الاعراب میں بات ہوگی) کا مادہ "ی وم" اور وزن اصلی "اَفْعَالٌ" ہے گویا یہ دراصل "اَيْوَامٌ" تھا (جو "يَوْمٌ" بمعنی "دن" کی جمع مکسر ہے)۔ پھر "یائے ساکنہ کے بعد آنے والی واو متحرک کو بھی "یا" میں بدل کر دونوں "یا" باہم مدغم کر کے "یہ لفظ بصورت "اَيَّامٌ" لکھا اور بولا جاتا ہے یعنی اَيْوَامٌ = اَيْيَامٌ = اَيَّام۔ "اَيَّام" (نکرہ) کے معنی "کچھ دن، کئی دن" ہیں۔ لفظ "یوم" (جو "ایام" کا واحد ہے) کے مادہ فعل باب وغیرہ پر الفاتحہ ۴: [۱: ۳: ۱ (۲)] میں بات ہوئی تھی۔ "مَعْدُوْدَةٌ" کا مادہ "ع د د" اور وزن "مَفْعُوْلَةٌ" ہے (آیت میں لفظ منصوب آیا ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل مجرد (عَدَّ يَعُدُّ = گننا، شمار کرنا) کے باب و معنی وغیرہ پر البقرہ: ۲۴ [۲: ۱۷: ۱ (۱۵)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● لفظ "معدودۃ" اس فعل مجرد (عَدَّ يَعُدُّ) سے اسم مفعول تانیث کا صیغہ ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے "گنی ہوئی، شمار کی گئی"۔ یہ لفظ یہاں "ایام" (جمع مکسر) کی صفت (ہونے کی وجہ سے تانیث آیا) ہے۔ اس لیے "اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً" (جو آیت میں منصوب آیا ہے) کا لفظی ترجمہ ہے "گنے ہوئے کچھ دن"۔ جسے مترجمین نے سلیس اور بامحاورہ بنانے کے لیے "کئی دن گنتی کے/ چند روز گنے چنے/ تھوڑے روز جو شمار ہو سکیں/ گنتی کے چند روز گنتی کے دن/ اور چند گنے چنے دن" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے البتہ صرف "چند روز" میں "معدودۃ" کا ترجمہ نظر انداز ہوا ہے اور "جو شمار ہو سکیں" میں اصل عبارت

(صیغۂ اسم مفعول) سے تجاوز ہے۔ مفہوم درست ہے۔

۲:۵۰:۱(۲) [قُلْ] کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "اُفْعُلْ" ہے۔ اصلی شکل "اُقْوُلْ" بنتی تھی جس میں "واو" متحرکہ کی حرکت (ضمہ ـُـ) ماقبل ساکن حرف صحیح (ق) کو دی جاتی ہے تو خود اجتماع ساکنین (واو اور ل) کے باعث گر جاتی ہے اور ابتدائی ہمزۃ الوصل (ق کے متحرک ہو جانے کی بناء پر) گرا دیا جاتا ہے اور لفظ بصورت "قُلْ" لکھا اور بولا جاتا ہے گویا اُقْوُلْ = اُقُوْلْ = اُقُلْ = قُلْ۔ اب اس کا وزن "فُلْ" رہ گیا ہے۔

● یہ (قُلْ) فعل مجرد قال یقول (جس کے باب و معنی وغیرہ پر سب سے پہلے البقرہ:۸ [۲:۷:۱(۵)] میں بات ہوئی تھی) سے فعل امر مخاطب کا پہلا صیغہ ہے اس کی گردان "قُلْ، قُوْلَا، قُوْلُوا، قُوْلِي، قُوْلَا اور قُلْنَ" ہو گی۔ اور قرآن مجید میں اس فعل سے امر کی گردان کے یہ تمام صیغے مختلف مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔

● "قُلْ" کا لفظی ترجمہ تو ہے "تُو کہہ"۔ چونکہ یہاں اس فعل کے مخاطب اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے اردو محاورے کے مطابق صیغۂ احترام استعمال کرتے ہوئے بعض نے اس کا ترجمہ "کہو/کہہ دو" اور بعض نے "تم فرما دو/آپ کہیے/آپ یوں فرما دیجئے" سے کیا ہے۔ بعض نے صرف "کہہ دے" اور "کہہ" ہی رہنے دیا ہے۔ اور ایک دو نے آگے آنے والی سوالیہ عبارت کی بناء پر یہاں "قُلْ" کا ترجمہ ہی "پوچھو" سے کر دیا ہے جو اصل عبارت سے ہٹ کر ہے۔

۲:۵۰:۱(۳) [اَتَّخَذْتُمْ] یہ لفظ دراصل "اَ اِتَّخَذْتُمْ" ہے جس کے ابتدائی ہمزۂ استفہام (أ = کیا؟) کی وجہ سے صیغہ "اِتَّخَذْتُمْ" کا ابتدائی ہمزۃ الوصل تلفظ سے تو ساقط ہونا ہی تھا (جیسے واتَّخذتُم یا فَاتَّخذتُم یا ثُمَّ اتَّخذتُم میں ہوتا ہے)۔ تاہم قرآن کی املاء (رسم الخط) میں یہ قاعدہ ہے کہ ہمزۂ استفہام کے بعد اگر کوئی ایسا صیغۂ فعل آرہا ہو جو ہمزۃ الوصل سے شروع ہوتا ہو (اور ایسا عموماً کسی مزید فیہ ماضی کے صیغے میں ہی ہوتا ہے)، تو ایسے ہمزۃ الوصل کو کتابت سے بھی ساقط کر دیا جاتا ہے یعنی اسے لکھا ہی نہیں جاتا۔ اس طرح یہ لفظ "اَاِتَّخَذْتُمْ" سے "اَتَّخَذْتُمْ" رہ جاتا ہے۔ خیال رہے گرنے والا ہمزۃ الوصل ہی ہے ہمزۂ استفہام برقرار (کتابت اور تلفظ دونوں میں) رہتا ہے ایسے الفاظ قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہ آئے ہیں۔ اور دراصل یہ "علم الرسم" کا مسئلہ ہے لہٰذا اس پر مزید بات "الرسم" میں ہو گی۔

● اور "اِتَّخَذْتُم" کا مادہ "ا خ ذ" اور وزن اصلی "اِفْتَعَلْتُم" ہے۔ جو دراصل "اِئْتَخَذْتُمْ" تھا۔ پھر فاء کلمہ (ہمزہ) "ت" میں بدل کر تاء افتعال میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اس مادہ (ا خ ذ) سے فعل مجرد (اخذ یأخذ = لینا، پکڑنا) کے باب معنی وغیرہ کے بارے میں البقرہ: ۴۸ [۲:۳۱:۱(۵)] میں وضاحت ہو چکی ہے۔

"اِتَّخَذْتُمْ" اس مادہ سے باب افتعال کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے اس باب (افتعال) سے فعل (اِتَّخَذَ یَتَّخِذُ = پکڑنا، بنا لینا) کے معنی و استعمال اور خصوصاً اس میں ہمزہ (فاء کلمہ) کے "تاء" (ت) میں بدل کر مدغم ہونے کے بارے میں بھی البقرہ:۵۱ [۲:۴۳:۱(۵)] میں بات ہو چکی ہے۔

● اس طرح "اَتَّخَذْتُمْ" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "کیا تم نے پکڑا یا لے لیا" جسے سیاقِ عبارت کی بنا پر اکثر نے ماضی قریب (برائے تاکید) کی صورت میں ترجمہ کیا ہے یعنی "کیا تم نے لیا ہے / لے لیا ہے / لے رکھا ہے / تم لے چکے ہو / پا چکے ہو" کی صورت میں۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

[عِنْدَ اللّٰهِ] کلمۂ ظرف "عند" کے معنی و استعمال کی وضاحت کے لیے دیکھئے البقرہ:۵۴ [۲:۳۴:۱(۱۱)]

"عند اللہ" کا ترجمہ "اللہ کے پاس" بنتا ہے جسے مضمونِ عبارت کے لحاظ سے "اللہ کے ہاں / اللہ کے یہاں / اللہ کے نزدیک" سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور بعض نے فعل (عہد لینا) کی مناسبت سے اس کا ترجمہ "اللہ سے / خدا سے / اللہ کے ہاں سے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔

[عَهْدًا] لفظ "عَهْدًا" (جو عبارت میں منصوب آیا ہے) کے مادہ (ع ھ د) وزن (فَعْلٌ) اور اس سے فعل مجرد (عَہِدَ یَعْہَدُ = عہد لینا) اور خود لفظ "عہد" کے معنی وغیرہ البقرہ:۲۷ [۲:۱۹:۱(۱۳)] میں گزر چکے ہیں۔ "عَهْد" کا اردو ترجمہ "قول، اقرار، قرار" سے کیا جاتا ہے اور خود لفظ عہد بھی اردو میں مستعمل ہے اس لیے بعض مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ "عہد" اور "وعدہ" اور "معاہدہ" سے ہی کر دیا ہے۔ بعض نے یہاں "عہدًا" کی تنکیر (نکرہ ہونا) کے باعث اردو ترجمہ میں "کوئی" (اقرار وغیرہ) کا اضافہ کیا ہے جب کہ بعض نے صرف لفظ کا ترجمہ کیا ہے اور تنکیر کو نظر انداز کیا ہے۔

۲:۵۰:۱(۴) [فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ] یہ ایک جملہ ہے جو "فاء (فَ)" عاطفہ (بمعنی پس / اس لیے) + لَنْ يُّخْلِفَ (جس پر ابھی بات ہوگی) + اللّٰهُ + عہد + ہ کا مرکب ہے۔

● "لَنْ يُّخْلِفَ" کا مادہ "خ ل ف" اور وزن (پورے صیغے کا) "لَنْ یُفْعِلَ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد کے معانی و استعمال پر البقرہ:۳۰ [۲:۲۱:۱(۴)] میں بات ہوئی تھی۔ زیر مطالعہ صیغۂ فعل (لن یخلف) اس مادہ سے بابِ افعال کا فعل مضارع معروف "منصوب منفی بلَنْ" (صیغہ واحد مذکر غائب) ہے جس میں کسی کام کے زمانۂ مستقبل میں پر زور نفی (یعنی ہرگز نہ ہونے) کا مفہوم ہوتا ہے۔ بابِ افعال سے فعل "اَخْلَفَ ... یُخْلِفُ اِخْلَافًا" ایک کثیر المعانی فعل ہے جن میں عموماً بنیادی معنی "... کو پیٹھ پیچھے کرنا / چھوڑ دینا / کر دینا" کے ہوتے ہیں۔ یہ فعل بطور لازم بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً "اَخْلَفَ الطَّعَامُ" (کھانے کا ذائقہ یا بو بدل جانا)، تاہم قرآن کریم میں یہ فعل بطور لازم کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ ہر جگہ بطور

فعل متعدی ہی آیا ہے۔ اس کے مختلف معانی اور استعمالات میں سے چند ایک یہ ہیں۔

① "وعدہ پورا نہ کرنا" (وعدہ کو پیچھے چھوڑ دینا)۔ اس صورت میں اس کا مفعول (وَعْدٌ یا عَھْدٌ) مفعول بنفسہ بھی آتا ہے اور "باء" کے صلہ کے ساتھ بھی مثلاً کہتے ہیں "اَخْلَفَ وَعْدَہٗ" یا "بِوَعْدِہٖ" (اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا) قرآن کریم میں ہے "فَاَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِیْ" (طٰہٰ: ۸۶) یعنی تم نے میرے وعدے کے خلاف کیا۔ اور اسی قسم کا استعمال زیر مطالعہ حصۂ عبارت "لَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗ" میں ہے۔

② "(کسی سے) وعدہ پورا نہ کرنا" اس صورت میں مفعول وہ آدمی ہوتا ہے جس سے وعدہ کیا گیا ہو۔ قرآن میں شیطان کا قیامت کے دن اپنے پیروکاروں سے یہ قول بیان ہوا ہے "وَوَعَدْتُّکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ" (ابراہیم: ۲۲) یعنی میں نے تم سے وعدہ کیا تھا مگر (اب) تم سے وعدہ خلافی کی ہے۔

③ اور کبھی یہ فعل اسی (وعدہ خلافی والے) معنوں میں دو مفعول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یعنی جس وعدہ کی خلاف ورزی کی جائے اور جس کے ساتھ کی جائے دونوں مفعول بنفسہ ہو کر آتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں، "اَخْلَفَہُ الوعدَ" (اس نے اس کے ساتھ وعدہ خلافی کی)۔ اور قرآن کریم میں ہے "اخلفوا اللّٰہَ ما وعَدوہ" (التوبۃ: ۷۷) یعنی "انہوں نے اللہ کے ساتھ کیے وعدہ کی خلاف ورزی کی۔

④ اور کبھی یہ فعل "کسی چیز کے بعد کوئی اور چیز دینا" کے معنی دیتا ہے مثلاً قرآن کریم میں ہے۔ "وَمَا انفقتم من شیءٍ فھو یُخْلِفُہٗ" (سبأ: ۳۹) یعنی "جو کچھ تم خرچ کرتے ہو تو وہ (اللہ) اس کی جگہ اور دیتا ہے۔

قرآن کریم میں اس (بابِ افعال والے) فعل سے مختلف صیغے ۱۴ جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ یہ فعل متعدی اور مفعول بنفسہ کے (ذکر کے) ساتھ استعمال ہوا ہے۔

● اس طرح اس عبارت (فلن یُخلفَ اللہ عھدَہ) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پس ہرگز اللہ تعالیٰ خلاف ورزی نہ کرے گا اپنے عہد کی" یا "اسے پیچھے نہیں چھوڑ دے گا)۔ اسی کو سلیس اور بامحاورہ بناتے ہوئے بعض مترجمین نے "البتہ اللہ ہرگز خلاف نہ کرے گا اپنے اقرار کے" اور "اللہ ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کرے گا" سے ترجمہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے "ہرگز یا البتہ" کے استعمال کے بغیر ترجمہ کیا ہے "یعنی "اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرے گا" یا "اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا" کی صورت میں۔ یہ گویا "لن یُخلف" کی بجائے "لا یُخلفُ" کا ترجمہ ہے۔ بعض حضرات نے غالباً سیاقِ عبارت (سابقہ عبارت کو) سامنے رکھتے ہوئے یا محاورہ کی خاطر زیر مطالعہ عبارت کے ترجمہ سے پہلے "اب" یا "تو اب" کا اضافہ کیا ہے یعنی "اب/ تو اب خلاف نہ کرے گا" کی طرح۔ اگرچہ اصل عربی میں اس "اب" کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس فعل (اخلف یُخلف) کے تمام تراجم میں لفظ "خلاف" استعمال ہوا

ہے جو خود اسی مادہ (خ ل ف) سے مشتق ایک لفظ ہے اور اردو میں عام مستعمل ہے (اگرچہ اپنے سارے عربی معانی کے ساتھ نہیں)۔

[ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون] اس جملے کے تمام کلمات کے معانی و استعمالات اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ مثلاً

"ام" (یا، یا پھر، کیا؟) کے لیے دیکھئے [۲: ۵: ۱ (۴)]۔ "تقولون" کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "تَفْعُلُوْن" ہے اور یہ فعل قال یقول (کہنا) سے مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے (یعنی تم کہتے ہو) مزید لغوی و صرفی بحث کے لیے دیکھئے [۲: ۹: ۱ (۴)] نیز [۲: ۱۹: ۱ (۶)] کے بعد بحث "یقولون" "علی" کے معانی [۱: ۶: ۱ (۳)] میں اور چاہیں تو اسم جلالت (اللہ) کی لغوی بحث "بسم اللہ" میں دیکھئے۔ "ما" جو یہاں موصولہ (یعنی "وہ جو کہ) ہے کے استعمال کے لیے دیکھئے [۲: ۲: ۱ (۵)] اور [۲: ۱۹: ۱ (۷)]

"لا تعلمون" جو "ع ل م" مادہ سے فعل مجرد "علِم یعلَم" (جاننا) سے فعل مضارع معروف منفی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے (یعنی "تم نہیں جانتے ہو) مزید کے لیے دیکھئے [۲: ۱۲: ۱۰ (۳)]

● اس طرح اس فقرے کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "یا تم کہتے ہو اللہ پر وہ جو تم نہیں جانتے"۔ جسے ذرا سلیس اور بامحاورہ کرتے ہوئے "خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں" / "خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں مطلق علم نہیں" کی صورت دی گئی ہے بعض حضرات نے اردو محاورے کی بنا پر یہاں "تقولون" (کہتے ہو) کا ترجمہ "(اللہ پر) جوڑتے ہو/ جوڑ رہے ہو/ باتیں جوڑتے ہو" سے کر دیا ہے بعض نے اس پوری عبارت کا ترجمہ "اللہ تعالےٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے" کی صورت میں کیا ہے جو ترجمہ سے زیادہ تفسیر ہے۔ جب کہ بعض نے "بے جانے بوجھے اللہ پر جھوٹ بولتے ہو" سے ترجمہ کیا ہے جو محاورہ و مفہوم کے لحاظ سے درست سہی مگر اصل الفاظ سے ہٹ کر اور "حد ترجمہ" سے باہر ہے۔

● گویا اس جملے کے الگ الگ اجزاء کے تراجم یوں کیے گئے ہیں (ہر ایک کا پہلا ترجمہ اصل لفظی ہے) "ام تقولون" = کیا تم کہتے ہو/ جوڑتے ہو/ جوڑ رہے ہو/ جھوٹ بولتے ہو "علی اللہ" = اللہ پر/ خدا کے بارے میں/ اللہ کے ذمے "ما" = وہ جو/ وہ بات جس کا/ ایسی باتیں جن کا/ ایسی بات جس کی "لا تعلمون" = تم نہیں جانتے/ تمہیں علم نہیں/ تمہیں مطلق علم نہیں/ کوئی علمی سند پاس نہیں رکھتے/ بے جانے بوجھے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس ترجمے میں اصل الفاظ سے کتنا بُعد یا اس پر کتنا اضافہ ہے۔

۲ : ۵۰ : ۱ (۵) [بَلٰی] اگرچہ اسے بلحاظ مادہ "ب ل ی" سے ماخوذ قرار دیا جا سکتا ہے (اور یہی وجہ ہے کہ معاجم میں اس کا ذکر اسی مادہ کے ضمن میں کیا جاتا ہے)۔ تاہم یہ لفظ (بلیٰ) نہ اسم ہے نہ فعل بلکہ صرف ایک حرف ہے اور اسے "لا" اور "نعم" کی طرح حرفِ جواب کہتے ہیں۔

● یہ ہمیشہ کسی منفی جملے کے جواب میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مقصد "ردِّ نفی" (نفی کا انکار) ہوتا ہے یعنی منفی جملے میں جس بات کا انکار کیا گیا ہو۔ یہ لفظ اس انکار کا رد کرتا ہے اور اس کے مقابلے پر اس بات کا اقرار (یا اثبات) ثابت کرتا ہے۔ عموماً یہ کسی منفی جملۂ استفہامیہ کے جواب میں (اقرار کے مفہوم کے لیے) آتا ہے۔ اگرچہ بعض دفعہ بغیر استفہام کے منفی جملے کے جواب میں (نفی کو رد کر کے فعل منفی کا اقرار کرنے کے لیے) بھی آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں "نَعَمْ" (ہاں) اور "لَا" (نہیں) صرف استفہام کے جواب میں استعمال ہوتے ہیں۔

● مثلاً اگر کوئی کہے "أَزَيْدٌ فِي الْبَيْتِ" (کیا زید گھر میں ہے) تو اس کے جواب میں "نَعَمْ" (ہاں) یا "لَا" (نہیں) کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کہا جائے "أَلَيْسَ زَيْدٌ فِي الْبَيْتِ" (کیا زید گھر میں نہیں ہے) تو اس کے جواب میں اگر "نَعَمْ" (ہاں) کہا جائے تو اس کا مطلب ہوگا "نَعَمْ لَيْسَ زَيْدٌ فِي الْبَيْتِ" (ہاں زید گھر میں نہیں ہے)۔ اور اگر اس (أَلَيْسَ زَيْدٌ فِي الْبَيْتِ) کے جواب میں "بلیٰ" (ہاں) کہا جائے تو اس کا مطلب ہوگا "بَلٰى زَيْدٌ فِي الْبَيْتِ" (ہاں زید گھر میں ہی ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں "نَعَمْ" کا ترجمہ تو "ہاں" سے ہی کیا جاتا ہے مگر "بَلٰى" کا ترجمہ "کیوں نہیں/ہاں کیوں نہیں" سے کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی آدمی استفہام کے بغیر منفی جملہ "لَيْسَ زَيْدٌ فِي الْبَيْتِ" (زید گھر میں نہیں ہے) کہے اور سننے والا کہے "بَلٰى" تو اس کا مطلب ہوگا "تم غلط کہتے ہو بلکہ زید گھر میں ہی ہے"۔

● یہ لفظ "بلیٰ" قرآن کریم میں ۲۲ جگہ آیا ہے اور ان میں سے دس سے زیادہ مقامات پر تو یہ "استفہام مع نفی" کے جواب میں آیا ہے جیسے أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (الاعراف: ۱۷۲) اور أَوَلَمْ تُؤْمِنْ (البقرہ: ۲۶۰) میں ہے باقی تمام جگہوں پر یہ مطلقاً جحد (انکار اور نفی) کی تردید میں واقع ہوا ہے اور اسی قسم کا ایک یہ مقام (زیرِ مطالعہ) بھی ہے جس میں یہ کسی استفہام کے بغیر عبارت "لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ" کے رد اور انکار میں آیا ہے۔ اسی لیے اس کا ترجمہ "کیوں نہیں/ہاں کیوں نہیں" کی بجائے اثباتِ حقیقت کے طور پر "واقعی بات تو یہ ہے کہ/سچ تو یہ ہے کہ/بات یہ ہے کہ/بلکہ اصل یہ ہے کہ" کی صورت میں کیا گیا ہے۔

۲ : ۵۰ : ۱ (۶) [مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً] "مَنْ" یہاں موصولہ (یعنی جو کہ/جس نے کہ) بھی ہو سکتا ہے اور شرطیہ (یعنی جو کوئی بھی کہ/جس کسی نے بھی) بھی ہو سکتا ہے (دیکھئے البقرہ: ۸ [۲ : ۷ : ۱ (۴)])۔ اسی

لیے اس کا ترجمہ "جو/جو شخص/جو کوئی/جو کوئی بھی/جس نے/جن لوگوں نے" کیا گیا ہے (من بلحاظ لفظ واحد اور بلحاظ معنی جمع بھی استعمال ہوتا ہے)۔

● "کَسَبَ" (جو "ک س ب" مادہ سے فعل مجرد کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے) کے فعل، باب، معنی وغیرہ پر ابھی اوپر [۲: ۴۹: ۱ (۵) میں] بات ہو چکی ہے (کسَب یکسِبُ = کمانا) یہاں بعض مترجمین نے تو فعل ماضی کا ترجمہ ماضی سے ہی کیا ہے یعنی "جس نے کیا/کی/پلے باندھی" کی صورت میں مگر بیشتر حضرات نے "من" شرطیہ کی بنا پر ترجمہ مضارع یا مستقبل کے ساتھ کیا ہے یعنی "جو کماوے/کمائے/کرے/کرتا ہے/اختیار کرے گا" کی صورت میں۔

● "سَیِّئَة" کا مادہ "س و أ" اور وزن اصلی "فَیْعِلَة" ہے۔ اس کی اصلی شکل "سَیْوِئَة" تھی پھر "یائے ساکنہ کے بعد والی "واوِ" مکسورہ بھی ساکن ہو کر "یا" میں مدغم ہو جاتی ہے۔ [دیکھئے ۲: ۱۴: ۱ (۲) میں کلمہ "صیّب" کی بناوٹ کی بحث] ۔ اس مادہ (س و أ) سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کی بحث البقرہ: ۴۹ [۲: ۳۲: ۱ (۴)] میں گزر چکی ہے

اس طرح لفظ "سیئة" کے معنی "برائی، گناہ، اور بدی" ہیں اور بظاہر یہ لفظ اسم ذات (جو کسی چیز کا نام ہو) معلوم ہوتا ہے۔ تاہم بعض دفعہ یہ لفظ بری (شے) کے معنی میں بطور اسم صفت بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "شفاعة سیئةً" (النساء: ۸۵) میں ہے یعنی "بری سفارش"۔ تاہم غور کیا جائے تو "سیئة" (برائی - بدی کے معنی میں بھی) دراصل "اعمالٌ سیئةٌ" ہی ہوتا ہے۔ یعنی ایسے موقع پر دراصل "سیئة" ایک محذوف موصوف کی صفت ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض مترجمین نے یہاں "سیئة" کا ترجمہ "بری باتیں/برے کام" سے کیا ہے۔ یہی صورت اس کے مقابلے کے لفظ "حَسَنَةٌ" کی ہے جو دراصل تو اسم صفت ہی ہے (بمعنی اچھا/عمدہ/نیک) اور بطور اسم ذات (دراصل محذوف موصوف کے ساتھ) بھی استعمال ہوتا ہے (بمعنی نیکی/اچھائی)۔

لفظ "سیئة" (واحد) بصورت معرفہ یا نکرہ قرآن کریم میں ۲۲ جگہ آیا ہے اور "سیئات" (بصورت جمع معرفہ نکرہ مفرد مرکب) ۳۶ جگہ آیا ہے۔

۲: ۵۰: ۱ (۷) [وَاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓـئَتُہٗ] یہ بھی ایک پورا جملہ ہے جو "وَ" عاطفہ (اور) + "احاطت" (جس پر بات ہو گی) + "بہ" (جو بار الجر (ب) + ضمیر مجرور "ہ" ہے بمعنی "اس کو") + "خَطِیْٓـئَتُہٗ" (جس پر بات ہو گی) کا مرکب ہے۔

● "اَحَاطَتْ" کا مادہ "ح و ط" اور وزن اصلی "اَفْعَلَتْ" ہے جس کی اصلی شکل "اَحْوَطَتْ" تھی پھر اس

میں واؤ متحرکہ کی حرکت (ـَ) اس کے ماقبل ساکن حرفِ صحیح (ح) کو دے کر خود "واؤ" کو اس کے ماقبل کی حرکت (جواب فتحہ ہو گئی ہے) کے موافق حرف (الف) میں بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے گویا اَحْوَطَتْ = اَحَوْطَتْ = اَحَاطَتْ۔ اس مادہ (ح و ط) سے فعل مجرد کے باب معنی و استعمال کے بارے میں البقرہ: ۱۹ [۲:۱۴:۱(۱۳)] میں بات ہو چکی ہے۔

● "اَحَاطَتْ" اس مادہ سے بابِ افعال کا فعل ماضی صیغہ واحد مؤنث غائب ہے اس باب سے فعل (اَحَاطَ یُحِیْطُ = گھیر لینا) کے معنی اور طریق استعمال وغیرہ بھی مندرجہ بالا مقام [۲:۱۴:۱(۱۳)] میں بیان ہوئے تھے جس میں یہ بھی بیان ہوا تھا کہ یہ فعل (احاط یُحیط) "باء (ب) کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے چنانچہ اگلے لفظ "بہٖ" کی "باء" یہی صلہ ہے۔ اس طرح "وَاَحَاطَتْ بہٖ" کا ترجمہ بنتا ہے" اور وہ گھیرے میں لے چکی اس کو"۔ پھر بعض مترجمین نے "مَن" (مَن کسب سیئۃ" سابقہ جملے والا) کو موصولہ اور جملہ کو صرف خبریہ سمجھتے ہوئے اس کا ترجمہ بصیغۂ ماضی ہی رہنے دیا ہے یعنی "گھیر لیا اس کو/گھیرے میں لے لیا اس کو" کی صورت میں۔ اور بعض نے اسی (صیغۂ ماضی) کو بامحاورہ کرتے ہوئے"... کے پھیر میں آگیا/آگئے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں جمع کا صیغہ تو "مَن" کی وجہ سے آسکتا تھا مگر مجموعی ترجمہ اصل عبارت سے ہٹ کر ہے۔ بیشتر مترجمین نے 'مَنْ' کو شرطیہ سمجھتے ہوئے عبارت کا ترجمہ جملہ شرطیہ کی صورت میں اور اسی لیے فعل مضارع یا مستقبل کے ساتھ یعنی "گھیر لے اسے/اس کو گھیر لے/اس کو احاطہ کرے/اس کو گھیر لے گا" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو ترجمہ کے لیے اختیار کردہ فعل اور محاورے کے مطابق فعل مؤنث کا ترجمہ فعل برائے مذکر سے کرنا پڑا ہے۔

● "خَطِیْئَتُہٗ" کی آخری ضمیر مجرور (مضاف الیہ) "ہٗ" تو بمعنی "اس کا/کی/کے" ہے۔ اور لفظ "خَطِیْئَۃ" (جو مضاف ہو کر خفیف ہو گیا ہے) کا مادہ "خ ط أ" اور وزن "فَعِیلَۃٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب معنی وغیرہ کی بحث البقرہ: ۵۸ [۲:۳۷:۱(۶)] میں بسلسلہ کلمہ "خطایا" ہو چکی ہے بلکہ اس لفظ (خطیئۃ) (جس کی ایک جمع "خطایا" ہے) کے معنی اور ساخت وغیرہ پر بھی وہاں بات ہو چکی ہے اس لفظ کے رسم عثمانی پر آگے "الرسم" میں بات ہو گی۔

● اس طرح "خَطِیْئَتُہٗ" کا ترجمہ "اس کی خطا نے/اس کے گناہ نے/اپنے گناہ سے/اس کا گناہ" ("احاطت" کے لیے اختیار کیے گئے فعل کے مطابق فرق کے ساتھ) کے ساتھ کیا گیا ہے بعض نے "خطیئتہ" کا ترجمہ بصورت جمع (اس کے گناہ) کیا جسے معنیٰ مراد ہی کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ اصل لفظ تو واحد ہے۔

[فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ] یہ پورے دو جملے ہیں جن کے الگ لفظوں کا ترجمہ تو یوں ہے: "فَ" (پس/اس لیے/سو) "اولٰئک" = وہی ہیں/ایسے ہی لوگ/وہی/یہی لوگ۔

"اصحاب النار" = دوزخ کے رہنے والے/اہل دوزخ/دوزخی/دوزخ والے

["النار" = آگ/دوزخ] - "ھم" = وہ/وہ سب

"فیھا" = اس میں/اسی میں

"خٰلِدُوْنَ" = ہمیشہ رہنے والے/پڑے رہنے والے/ہمیشہ وہیں رہیں گے/پڑے رہیں گے، مندرجہ بالا تمام کلمات کی لغوی بحث البقرۃ: ۳۹ [۲:۲۷:۱] میں ہو چکی ہے۔ ماسوائے اس فرق کے کہ یہاں جملہ "فاء (ف) سے شروع ہوتا ہے اور وہاں "اولٰئک" سے شروع ہوا تھا۔

[وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ] اس کے ابتدائی "وَ" عاطفہ (بمعنی "اور") کو چھوڑ کر باقی عبارت (الذین ....الصالحات) کے تمام کلمات کی لغوی بحث اور تراجم وغیرہ البقرۃ: ۲۵ [۲:۱۸:۱] میں گزر چکے ہیں اس عبارت کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کیے اچھے کام"

[اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ] یہ بھی ایک مکمل جملہ اسمیہ ہے اس کے بھی تمام کلمات کی لغوی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ مثلاً

اُولٰئک = "وہ سب/لوگ" اور دیگر اسماء اشارہ البقرۃ: ۵ [۲:۴:۱(۱)] میں دیکھئے۔

اصحاب = "ساتھی/... والے" کے مادہ وغیرہ کی بحث کے لیے البقرۃ: ۳۹ [۲:۲۷:۱(۴)] میں دیکھئے۔

الجنۃ = "باغ/بہشت" کی لغوی بحث البقرۃ: ۲۵ [۲:۱۸:۱(۴)] میں اس کی جمع "جنات" کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ اس طرح اس عبارت کے تراجم ہیں: "وہی/ایسے/یہی لوگ ہیں جنت والے/اہلِ جنت/جنتی"۔ اردو میں چونکہ لفظ "جنت" (باغ/بہشت) مستعمل ہے اس لیے کسی نے اس کا ترجمہ کسی اور لفظ سے کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

[هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ] یہ جملہ اور اس کے تمام اجزاء کی لغوی تشریح سب سے پہلے البقرۃ: ۳۹ [۲:۲۷:۱] میں ہوئی تھی اور اس کے لفظی ترجمہ "وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں" کے علاوہ دیگر تراجم بھی وہاں بیان ہوئے تھے۔

۲:۵۰:۲ الإعراب

یہ قطعہ جس میں تین آیات ہیں نحوی اعتبار سے سات مستقل جملوں پر مشتمل ہے۔ ان کے اعراب کی تفصیل یوں ہے۔

(۱) وقالوا لن تمسّنا النارُ الّا ایامًا مّعدودۃً

[وَ] یہاں مستأنفہ ہے کیونکہ یہاں سے ایک الگ مضمون شروع ہوتا ہے [قالوُا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" ہے [لَنْ تَمَسَّنَا] میں "لَنْ تَمَسَّ" فعل مضارع معروف منصوب "بِلَنْ" صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ صیغہ کی تانیث آگے آنے والے فاعل "النارُ" (مؤنث سماعی) کے لیے ہے۔ علامتِ نصب (مضارع) یہاں "سَّ" کی فتحہ (ـَ) ہے۔ (جو دراصل "لَنْ تَمْسَسَ" تھا) اس کا آخری "نَا" ضمیر منصوب متصل ہے جو فعل (لَنْ تمسّ) کا مفعول بہ ہے۔

[النارُ] فاعل (لن تمسّ) ہے اس لئے مرفوع ہے علامتِ رفع آخری "ر" کا ضمہ (ـُ) ہے [الّا] حرفِ استثناء ہے جو نفی کے بعد آنے کی وجہ سے حصر کا کام دے رہا ہے اس کا ترجمہ "مگر صرف / محض" سے ہوگا۔ [اَیَّامًا] یہ "الّا" کی وجہ سے نہیں بلکہ فعل "لن تمسّ" کا ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس لیے کہ اگر آپ فعل میں سے حرفِ نفی "لن" اور حرفِ استثناء "الّا" نکال دیں تو عبارت بنے گی۔ تمسّنا النارُ ایامًا (آگ ہمیں کچھ دن چھوئے گی) یعنی "ایامًا" بطور ظرف منصوب آئے گا [مَعْدُوْدَۃً] "ایامًا" کی صفت لہٰذا منصوب ہے اور "ایام" کے جمع مکسر ہونے کی وجہ سے صفت واحد مؤنث لائی گئی ہے۔ اس طرح جملہ "لن تمسّنا النارُ الّا ایامًا معدودۃً" ابتدائی فعل "قالوا" کا مفعول (مقول) ہو کر محلاً نصب میں ہے۔ اس پورے جملے (وقالوا . . . . معدودۃً) کے تراجم اور حصر کے لیے اردو الفاظ پر حصہ "اللغۃ" میں بات ہو چکی ہے۔ یہاں ایک جملہ مکمل ہوتا ہے، اسی لیے اس کے آخر پر وقفِ مطلق کی علامت (ط) ڈالی جاتی ہے۔

(۲) قل اَتَّخَذْتُمْ عندَ اللہِ عھدًا فلن یُّخْلِفَ اللہُ عھدَہٗ:

[قُلْ] فعل امر مع ضمیر فاعل مستتر "اَنْتَ" ہے۔ اور یہاں سے ایک الگ جملہ (مستانفہ) شروع ہوتا ہے [اَتَّخَذْتُمْ] کا ابتدائی ہمزہ (اَ) استفہام کا ہے اور فعل "اِتَّخَذْتُمْ" کا ابتدائی ہمزۃ الوصل (ا) تلفظ اور کتابت دونوں سے (ایسے موقع پر) ساقط ہو جاتا ہے یعنی نہ لکھا جاتا ہے اور نہ بولا جاتا ہے "اِتَّخَذْتُم" فعل ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر الفاعلین "انتم" مستتر ہے۔ اور یہاں یہ فعل (اِتَّخَذَ) صرف ایک ہی مفعول کے ساتھ استعمال ہوا ہے (جو آگے آرہا ہے) ورنہ عام طور پر فعل "اِتَّخذ" کے دو مفعول آتے ہیں۔ [عِنْدَ اللہِ] میں "عِنْدَ" ظرف مضاف (لہٰذا) منصوب ہے اور "اللہ" اس (ظرف) کا مضاف الیہ (لہٰذا) مجرور ہے۔ اس ظرف (عند اللہ) کا تعلق فعل "اِتَّخذتم" سے ہے اور ظرف کے فعل پر مقدم ہونے (پہلے آنے) کی وجہ سے اس میں تاکید یعنی "اللہ ہی کے ہاں" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے تاہم بیشتر

مترجمین نے یہاں اس "ہی" کو نظر انداز کیا ہے۔ [عهدا] فعل "اتخذتم" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے۔ عام ترتیبِ عبارت "اتخذتم عهداً عند الله" بنتی تھی مگر ظرف کو تاکید یا تعجب کے لیے مقدم کر دیا گیا ہے [فلن يُخلِفَ] کی ابتدائی "فاء" (فَ) سببیہ (بمعنی "اس لیے") ہے اور اس کی وجہ سے یہاں ایک منصوب فعل "تقولوا" محذوف ہے (فاء سببیہ کے بعد فعل مضارع منصوب آتا ہے) یعنی تقدیر (اصل مفہوم) عبارت کچھ یوں بنتی ہے "اتَّخذتم عند اللهِ عهداً فتقولوا لن يُخلِفَ ....." (کیا تم نے اللہ سے عہد کر رکھا ہے جس کی بنا پر کہتے ہو کہ وہ ہرگز خلاف نہیں جائے گا) "لن يُخلِفَ" بھی فعل مضارع منصوب "بلن" ہے اور اس میں علامتِ نصب آخری فاء کی فتحہ (فَ) ہے۔
[اللهُ] فعل "لن يُخلِفَ" کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے۔ [عهدَهُ] مضاف (عهد) اور مضاف الیہ (ہ) مل کر فعل "فلن يُخلِفَ" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے۔ علامتِ نصب "د" کی فتحہ (ـَ) ہے۔ اس طرح یہاں بھی "قُلْ" کے بعد والا تمام جملہ (اتخذتم . . . عهدَهُ) فعل "قُلْ" کا مقول (مفعول) ہو کر محل نصب میں ہے۔

(۳) أم تقولونَ على الله مالا تعلمون

[أَمْ] حرف عطف بمعنی حرفِ استفہام (کیا؟) بھی ہو سکتا ہے جو ابتدائی همزة التسوية (اتخذتم والا) کے بعد آتا ہے اور جسے ہمزۂ معادلہ یا ہمزۂ متصلہ بھی کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ "کیا/ یا/ آیا" سے ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ "أم" منقطعہ ہو جس میں "بَلْ" (بلکہ) کا مفہوم ہوتا ہے۔ همزة التسوية اور "أم" معادلہ متصلہ یا منقطعہ کی وضاحت کے لیے دیکھئے البقرہ: ۵ [۲:۵:۱(۴)]
[تقولون] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "انتم" ہے جس کا "أم" کے ذریعے سابقہ جملے (۲) پر عطف ہو سکتا ہے [على اللهِ] جار (على) مجرور (اللهِ) مل کر متعلق فعل (تقولون) ہیں [مَا] موصولہ ہے جو یہاں فعل "تقولون" کا مفعول ہونے کے باعث منصوب ہے (اگرچہ مبنی ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی اعرابی علامت ظاہر نہیں ہے [لا تعلمون] فعل مضارع معروف منفی "بلا" (نافیہ غیر عاملہ) ہے جس میں واو الجمع (ـُـوْ) ضمیر الفاعلین "انتم" کی علامت ہے۔ اس کے بعد ایک ضمیر عائد محذوف ہے یعنی یہ دراصل "لا تعلمونه" (تم جس کو نہیں جانتے ہو) تھا۔ اور یہ جملہ فعلیہ (لا تعلمون) "ما" موصولہ کا صلہ ہے اور صلہ موصول مل کر "تقولون" کا مفعول لہٰذا محلاً منصوب ہے۔ اگرچہ بعض نحوی حضرات صرف موصول کا اعراب بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "صلہ" کا کوئی اعراب نہیں ہوتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ صلہ موصول مل کر ہی جملے کا کوئی جزء (مبتدا، خبر، فاعل، مفعول وغیرہ) بنتے ہیں صرف

اسم موصول تو جملے کا الگ جز نہیں ہوتا۔

ابتدائی "أم" کی وجہ سے یہ جملہ (۱۳) سابقہ جملے (۱۲) پر عطف بھی ہوسکتا ہے اور اس طرح بلحاظ مضمون یہ دونوں جملے (۱۲، ۱۳) دراصل ایک ہی طویل جملہ بنتے ہیں۔

(۴) بلی من کسب سیئۃً واحاطت بہ خطیئتہ فاولئک اصحب النار

[بلی] حرف جواب ہے جو سابقہ منفی بجحد (زور سے انکار) والے جملے (لن تمسّنا النار) کے ردّ میں آیا ہے (اس کے ترجمہ اور اس کی وجہ پر حصہ "اللغۃ" میں بات ہوچکی ہے) [مَنْ] عام اسم موصول بھی ہو سکتا ہے بمعنیٰ "وہ شخص / لوگ جو کہ"۔ اور یہاں یہ اسم شرط بمعنیٰ "جو کوئی بھی کہ" بھی ہوسکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ اپنے (آگے آنے والے) صلہ کے ساتھ مل کر (یا "شرط" کے لیے) مبتدا کا کام دے رہا ہے لہٰذا محلاً مرفوع ہے اردو مترجمین نے دونوں طرح (یعنی "من" موصولہ یا شرطیہ کے ساتھ) ترجمہ کیا ہے (دیکھیے حصہ "اللغۃ") ویسے شرطیہ والا ترجمہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہاں کسی خاص شخص یا اشخاص کی بات نہیں ہوئی بلکہ ایک عام (عمومی) قانون بیان ہوا ہے۔ [کسب] فعل ماضی مع ضمیر الفاعل "ھو" ہے جو "من" کے لیے ہے۔ یہاں بصورت "مَنْ شرطیہ" یہ فعل محلاً مجزوم ہے اگرچہ فعل ماضی ہونے کے باعث "جزم" کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ [سیئۃً] فعل "کسب" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے [وَ] عاطفہ ہے اور [احاطت] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مؤنث غائب ہے یہ فعل (احاطت) یہاں واو عاطفہ کے ذریعے سابقہ فعل "کسب" پر عطف ہے یعنی "کسب ...... اور "احاطت" والے دونوں کام جمع ہو گئے [بہ] جار مجرور (بِ + ہ) فعل "احاطت" سے متعلق ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ "باء" (ب) فعل احاطت کا صلہ ہے اور اس طرح "بہ" مفعول ہو کر محل نصب میں ہے۔ [خطیئتہ] مضاف (خطیئۃ) اور مضاف الیہ (ہ) مل کر فعل "احاطت" کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے۔ علامت رفع "خطیئۃ" کی تاء (ۃ) کا ضمہ (ـُـ) ہے اور "خطیئۃ" مضاف ہو کر خفیف رہ گیا ہے۔ اس طرح "مَن" کے بعد والے دونوں جملے (کسب ... خطیئتہ) "مَنْ" کا صلہ بھی بن سکتے ہیں۔ اس صورت میں صلہ موصول مل کر (من ... خطیئتہ) مبتدا کا کام دے رہے ہیں جس کی خبر آگے آنے والا جملہ (فاولئک اصحب النار) ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "مَنْ" شرطیہ ہو اور اس کے بعد والے دونوں جملے (کسب .... خطیئتہ) اس (مَنْ) کے ساتھ مل کر جملہ شرطیہ کا ابتدائی حصہ (بیان شرط) بنتے ہیں۔ جس کا جواب شرط آگے آرہا ہے۔

[فاولئک] کی ابتدائی "فاء (فَ)" رابطہ کی ہے جو جوابِ شرط کے شروع میں آتی ہے اور اسی لیے اکثر مترجمین نے اس (فَ) کا ترجمہ (جوابِ شرط کی طرح) "تو / سو" سے کیا ہے۔ اور "اولئک"

اسم اشارہ (جمع) مبتدأ ہے اور [اصحاب النار] مضاف (اصحاب) اور مضاف الیہ (النار) مل کر خبر (الہٰذا) مرفوع ہے علامت رفع "اصحاب" کی "ب" کا ضمہ (ـُـ) ہے جو مضاف ہو کر تخفیف بھی ہے ("النار" تو مجرور بالاضافہ ہے)۔ اس طرح یہ جملہ (فاولئك اصحاب النار) "مَنْ" شرطیہ کا جواب شرط بھی ہو سکتا ہے اور اگر "مَن" اور اس کے صلہ کو مبتدا سمجھا جائے تو یہ (فاولئك اصحاب النار) اس کی خبر بھی بن سکتی ہے۔ اس صورت میں "فاء" سببیہ کا ترجمہ "پس/اس لیے" سے ہوگا ان دو تراکیب سے ترجمہ میں فرق پڑے گا کہ شرطیہ کی صورت میں ترجمہ "جو کوئی بھی . . . . تو/سو . . . ." سے ہوگا اور صلہ موصول مبتدا سمجھیں تو ترجمہ "جو لوگ کہ . . . . پس وہی . . . ." سے ہوگا۔ تاہم "مَنْ" کے بعد والے جملے کو شرطیہ سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہاں بات "کسی خاص آدمی یا آدمیوں" کی نہیں ہو رہی بلکہ ایک عام شرط (یا قانون) کا بیان ہے جو سب پر اطلاق پذیر ہوگا۔ اور اس جواب شرط جملہ (فاولئك اصحاب النار) میں جمع کے صیغے (اولئك اور اصحاب) اس لیے آئے ہیں کہ "مَنْ" (جملہ ۴ والا) شرطیہ ہو یا موصولہ واحد جمع دونوں کا مفہوم رکھتا ہے۔

⑤ هم فيها خالدون

[هُم] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے اور [فيها] جار (فی) اور مجرور (ضمیر "ھا" جو النار یعنی آگ کے لیے ہے) مل کر متعلق خبر مقدم ہیں۔ اور اپنی خبر سے پہلے آنے کی وجہ سے اس میں "اس ہی میں/اسی میں" کا مفہوم پیدا ہوتا ہے جسے بعض مترجمین نے ملحوظ رکھا ہے۔ [خالِدُون] خبر مرفوع ہے اور یہ پورا جملہ اسمیہ (جو عام نثر میں "هم خالدون فيها" ہوتا) سابقہ خبر "اصحاب النار" (جملہ ۴) میں سے "اصحاب" کا بیان یا صفت یا حال بھی ہو سکتا ہے اور "النار" کا بھی۔ پہلی صورت میں مفہوم ہوگا "ایسے اصحاب النار" (دوزخی) جو ہمیشہ اسی آگ میں رہیں گے۔ اور دوسری صورت میں مفہوم ہوگا "ایسی آگ کے اصحاب" (والے) جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ تاہم سیدھی سادہ اور قابل فہم ترکیب یہی ہے کہ یہ جملہ (هم فيها خالدون) بھی (فاولئك اصحاب النار) کی طرح جواب شرط ہے یا مبتدأ (من كسب . . . . خطيئته) کی دوسری خبر ہے۔

⑥ والذين امنوا وعملوا الصلحت اولئك اصحب الجنة۔

[وَ] عاطفہ ہے جو جملے کو جملے سے ملاتی ہے [الذين] اسم موصول مبتدأ (الہٰذا) مرفوع ہے مگر مبنی ہونے کی بنا پر ظاہری علامت رفع سے خالی ہے۔ [امنوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین "هم" ہے اور یہ جملہ فعلیہ (فعل فاعل) ہو کر "الذين" کا صلہ ہے [وَ] عاطفہ ہے اور [عملوا] بھی فعل ماضی

معروف مع ضمیر الفاعلین "ھم" ہے اور [الصالحات] فعل "عملوا" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے۔ علامتِ نصب آخری "اتِ" ہے جس میں معرف باللام ہونے کی وجہ سے ایک کسرہ (ـِ) آئی ہے۔ اور یہ "الصلحات" بھی دراصل ایک محذوف موصوف کی صفت ہے یعنی مفہوم "الاعمال الصالحات" کا ہے۔ یہ دوسرا جملہ (عملوا الصالحات) جو فعل فاعل مفعول پر مشتمل ہے، واو عاطفہ کے ذریعے پہلے جملہ فعلیہ (اٰمنوا جو فعل مع فاعل ہے) پر عطف ہے یعنی جن لوگوں میں "اٰمنوا" اور "عملوا الصالحات" والی دونوں باتیں جمع ہوں گی) اور یہ دونوں عطف معطوف جملے (اٰمنوا وعملوا الصالحات) اسم موصول "الذین" کا صلہ بنتے ہیں اور صلہ موصول مل کر (الذین ..... الصالحات) مبتدا کا کام دے رہے ہیں [اولٰئک] اسم اشارہ مبتدا (لہٰذا یہاں) مرفوع ہے [اصحاب الجنۃ] مضاف (اصحاب) اور مضاف الیہ (الجنۃ) مل کر "اولٰئک" کی خبر ہے اسی لیے "اصحاب" مرفوع ہے علامتِ رفع "ب" کا ضمہ (ـُ) ہے کیونکہ یہ بوجہ اضافت خفیف بھی ہے اور "الجنۃ" مجرور بالاضافۃ ہے جس میں علامتِ جر آخری "ۃ" کی کسرہ (ـِ) ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ (اولٰئک اصحاب الجنۃ) صلہ موصول (الذین ..... الصلحت) پر مشتمل مبتدا کے لیے خبر کا کام دے رہا ہے۔

⑦ ھم فیھا خالدون

سابقہ جملے (۵) کی طرح ہے البتہ اس میں "فیھا" کی ضمیر تانیث (ھا) "الجنۃ" کے لیے ہے۔ یہاں بھی "فیھا" خبر (خالدون) پر مقدم ہے اس لیے اس کا مفہوم "اسی میں" کا ہے۔ اور یہ فرق بھی ہے کہ یہ جملہ (ھم فیھا خالدون) کسی شرط کے جواب میں نہیں ہے (جیسا کہ جملہ ۵ تھا) بلکہ یہ پورا جملہ (جس کی سادہ نثر "ھم خالدون فیھا" بنتی ہے) "الذین" سے شروع ہونے والے (صلہ موصول مل کر بننے والے) مبتدا (والذین اٰمنوا وعملوا الصلحت) کی خبر ثانی بنتا ہے (پہلی خبر "اولٰئک اصحب الجنۃ" تھی) اور اس جملہ (ھم فیھا خالدون) کو بھی "اصحاب" یا "الجنۃ" کی صفت یا حال بنانے کی کھینچا تانی کی جا سکتی ہے مگر خبر ثانی سمجھنا زیادہ قابلِ فہم ہے۔

۲:۵۰:۳ الرسم

زیرِ مطالعہ قطعہ آیات میں چار کلمات (خطیئتہ، اصحب، خلدون، اور الصلحت) ایسے ہیں جن کا رسم قرآنی (عثمانی) ان کے عام رسم املائی سے مختلف ہے۔ ایک کلمہ (احاطت) کا رسم عثمانی مختلف فیہ ہے اور دو کلمات (اتخذتم اور اولٰئک) ایسے ہیں جن کا رسم اگرچہ خلافِ قیاس ہے تاہم ان کا رسم املائی اور رسم عثمانی مشترک (یکساں) ہے۔ تفصیل یوں ہے۔

(۱) "خَطِیٓـٔتُهٗ" جس کا رسم املائی "خَطِیْئَتُه" ہے یعنی اس (رسم معتاد) میں تین نبرات (دندانے) ہیں۔ پہلا "ط" کے بعد والی "یاء" کا۔ دوسرا اس کے بعد مرکز ہمزہ کے لیے (کیونکہ عام املاء میں ہمزہ متوسطہ متحرکہ بعد ساکن "یاء" کے نبرہ پر لکھا جاتا ہے[1]) اور تیسرا (نبرہ) "تاء" کے لیے ہے۔ مگر رسم عثمانی میں اس لفظ کی کتابت میں ہمزہ کے لیے کوئی مرکز بصورت "نبرۂ یاء" نہیں لکھا جاتا۔ اس لیے کہ اس صورت میں دو "یاء" (ط کے بعد والی اور مرکز ہمزہ والی) جمع ہو جاتی ہیں اور یہ قاعدہ (رسم عثمانی کا) پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اس میں دو الف، دو "واو" اور دو "یاء" آجائیں (جسے اجتماع مثلین کہتے ہیں) تو صرف ایک ہی حرف لکھا جاتا ہے[2]۔ البتہ اس کے بعض مستثنیات ہیں جو اپنی اپنی جگہ بیان ہوں گے۔ یہ لفظ بصورت واحد (خطیئة) اور بصورت جمع سالم (خطیئات) مفرد و مرکب صورتوں میں قرآن کریم کے اندر پانچ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح (مرکز ہمزہ کے لیے نبرہ کے بغیر) لکھا جاتا ہے۔

(۲) "اصحٰب" جس کا رسم املائی "اصحاب" ہے قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ مختلف صورتوں میں ۸۰ کے قریب مقامات پر آیا ہے) "بحذف الالف بعد الحاء" یعنی بصورت "اصحٰب" لکھا جاتا ہے البتہ اس کا واحد "صاحب" (جو معرفہ نکرہ مذکر مؤنث مفرد مرکب شکلوں میں قریباً ۱۶ جگہ آیا ہے) عموماً باثبات الف لکھا جاتا ہے۔ اس کا مفصل بیان حسبِ موقع آئے گا۔ لفظ "اصحٰب" زیر مطالعہ عبارت میں بھی دو دفعہ آیا ہے۔

(۳) "خٰلدون" جس کی رسم املائی "خالدون" ہے یہاں دونوں جگہ اور قرآن کریم میں ہر جگہ (اور یہ لفظ مختلف اعرابی صورتوں (رفع نصب جر) میں (خالدون / خالدین) ستر کے قریب جگہوں پر آیا ہے)۔ "بحذف الالف بعد الخاء" لکھا جاتا ہے۔ البتہ اس کا واحد (خالد) جو چار جگہ آیا ہے، عموماً باثبات الف لکھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی مفصل بات حسب موقع ہوگی۔

(۴) "الصلحٰت" جس کا نام رسم املائی "الصالحات" ہے۔ قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ اس طرح بصورت جمع مؤنث سالم معرفہ یا نکرہ قرآن کریم میں ساٹھ سے زائد مقامات پر آیا ہے) بحذف الالفین یعنی دونوں الف (ایک "ص" کے بعد دوسرا "ح" کے بعد) حذف کر کے لکھا جاتا ہے۔ اگرچہ پڑھے

---

[1] رسم املائی کے اس قاعدہ کے لیے دیکھئے نخبۃ الاملاء (للخلیفہ) ص ۱۱۰۔ اور کتاب الکتاب ص ۱۶۔

[2] رسم عثمانی کے اس قاعدہ کے لیے دیکھئے نثر المرجان ۱: ۱۷۴، والمقنع (للدانی) ص ۴۹۔ نیز دیکھئے اسی کتاب میں [۲:۲۲:۳] کلمہ "انبؤنی" کا رسم۔ جہاں یہ قاعدہ بیان ہوا ہے۔

دونوں الف جاتے ہیں اور ضبط کے مختلف طریقوں سے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اس کے واحد مذکر (صالح) اور جمع (صالحون) نیز تثنیہ (صالحین) وغیرہ کے رسم عثمانی پر حسب موقع بات ہوگی۔

⑤ "اَحَاطَتْ" یہ لفظ اس صورت میں (فعل ماضی صیغہ واحد مؤنث غائب) قرآن کریم میں صرف اسی ایک جگہ آیا ہے۔ الدانی نے اس کے حذفِ الف بعد الحاء کا کہیں ذکر نہیں کیا جو اس (الف) کے اثبات کو مستلزم ہے بلکہ علامہ ارکاٹی نے اس کے "اثبات الالف بعد الحاء المہلہ" پر اتفاق بیان کیا ہے کیونکہ یہ "الف" "واو" کی بدلی ہوئی صورت ہے[1]۔ تاہم ابوداؤد کی طرف منسوب قول کی بناء پر اسے بحذف الالف بعد الحاء لکھا جاتا ہے[2]۔ چنانچہ لیبیا اور ایشیائی ممالک (برصغیر، ایران، ترکی وغیرہ) کے مصاحف میں اسے باثباتِ الف (احَاطَت) لکھا جاتا ہے جب کہ بیشتر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اسے بحذفِ الف (احٰطَتْ) لکھا گیا ہے۔ ویسے بابِ افعال کے اس فعل کا صیغہ ماضی واحد مذکر غائب (احاط) جو قرآن کریم میں پانچ جگہ آیا ہے ہر جگہ باتفاق اثباتِ الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے (یعنی "احاط")

⑥ "اَتَّخَذْتُمْ" جو دراصل "أَاِتَّخَذْتُمْ" ہے جس میں پہلا ہمزۂ استفہام اور دوسرا ہمزۃ الوصل ہے۔ رسم عثمانی میں (اور بعض دفعہ رسم املائی میں بھی) کئی مواقع پر ہمزۃ الوصل کتابت سے بھی ساقط کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعض مواقع پہلے گزر چکے ہیں (مثلاً "للمتقین" ۲:۱:۲ میں) اور بعض آگے آئیں گے۔ ہمزۃ الوصل کے کتابت سے ساقط ہونے کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ ہے کہ اگر ہمزۂ استفہام کے معاً بعد ہمزۃ الوصل مکسور (ــِ والا) آئے (جو عموماً خماسی یعنی "پانچ حرفی" اور سداسی یعنی "چھ حرفی" ماضی یا اس کے مصدر میں ہوتا ہے) تو یہ ہمزۃ الوصل لکھنے میں گرا دیا جاتا ہے (پڑھا تو ویسے بھی نہ جاتا)، اس کی ایک مثال یہ (زیر مطالعہ) لفظ "اَتَّخَذْتُمْ" ہے اس کے علاوہ اس قسم کے کئی الفاظ مثلاً "اَطَّلَعَ" (مریم ۷۹) "اَسْتَكْبَرْتَ" (الزمر: ۷۵) اور "اَفْتَرٰی" (سبا: ۸) وغیرہ ہیں جن کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ اگر ہمزۂ استفہام اور ہمزۂ وصل کے درمیان کوئی اور حرف آ جائے تو ہمزۃ الوصل کتابت میں برقرار رہے گا (اگرچہ تلفظ میں نہیں آئے گا) مثلاً "اَفَاتَّخَذْتُمْ" (الرعد ۱۶) میں۔ اسی طرح اگر ہمزۂ استفہام کے معاً بعد ہمزۃ الوصل مفتوح (ـَـ والا) آئے تو اس کا الگ قاعدہ ہے جو اپنی جگہ بیان ہوگا۔ ہمزۂ استفہام کے بعد مکسور

---

[1] دیکھئے نثر المرجان ۱: ۱۷۳

[2] سمیر الطالبین ص ۴۴

ہمزۃ الوصل کے کتابت سے ساقط ہونے کا قاعدہ رسم املائی میں بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے[1]۔ اس طرح یہ لفظ (اَتَّخَذْتم) رسم عثمانی اور رسم املائی دونوں میں بحذفِ ہمزۃ الوصل لکھا جاتا ہے۔

⑦ "اولئک" بھی ان کلمات میں سے ہے جن کا رسم املائی بھی خلافِ قیاس اور رسم عثمانی ہی کی یادگار ہے اس لفظ کے رسم پر البقرہ: ۵ کی بحث الرسم یعنی [۲:۴:۳] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

۲:۵۰:۴ الضبط

زیر مطالعہ تین آیات کے کلمات میں ضبط کے تنوع کو مندرجہ ذیل مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے ان میں سے بیشتر کلمات کے ضبط کی مثالیں پہلے بھی گزر چکی ہیں تفصیل یوں ہے۔

وَ، وَ / قَالُوا، قَالُوا، قَالُوْا، قَالُوْا / لَنْ، لَن، لَن / تَمَسَّنَا، تَمَسَّنَا / النَّارُ، النَّارُ، اَلنَّارُ، اَلنَّارُ / اِلَّا، اِلَّا، اِلَّا، اِلَّا / اَيَّامًا، اَيَّامًا، اَيَّامًا، اَيَّامًا / مَّعْدُوْدَةً، مَّعْدُوْدَةً، مَّعْدُودَةً / قُلْ، قُلْ / اَتَّخَذْتُمْ، اَتَّخَذْتُمْ، اَتَّخَذْتُمْ / عِنْدَ، عِنْدَ، عِنْدَ / اللّٰهِ، اللّٰهِ، اللّٰهِ / عَهْدًا، عَهْدًا / فَلَنْ، فَلَن، فَلَن / يُّخْلِفَ، يُّخْلِفَ / اللّٰهُ (مثل سابق) عَهْدَهٗ، عَهْدَهٗ، عَهْدَهٗ / اَمْ، اَمْ، اَمْ / تَقُوْلُوْنَ، تَقُوْلُونَ، تَقُولُونَ / عَلَى، عَلَى / اللّٰهِ (مثل سابق) مَا، مَا، مَا / لَا، لَا، لَا / تَعْلَمُوْنَ، تَعْلَمُونَ، تَعْلَمُونَ / بَلٰى، بَلٰى، بَلٰى / مَنْ، مَن، مَن / كَسَبَ، كَسَبَ / سَيِّئَةً، سَيِّئَةً، سَيِّئَةً / وَ، وَ / اَحَاطَتْ، اَحَاطَتْ، اَحٰطَتْ، اَحٰطَتْ (بحذفِ الف) بِهٖ، بِهٖ

---

[1] اس قسم کے کلمات کے رسم عثمانی میں قاعدہ کے لیے دیکھئے المقنع (للدانی) ص ۲۹۔ دلیل الحیران (المارغنی) ص ۹۷، سمیر الطالبین (الضباع) ص ۷۷۔ اور رسم املائی کے قاعدہ کے لیے دیکھئے کتاب الکتّاب (لابن درستویہ) ص ۱۲ نیز نخبۃ الاملاء (الخلیف) ص ۵۲۔

بِهٖ/ خَطِيْٓئَتُهٗ، خَطِيْٓئَتُهٗ، خَطِيْٓئَتُهٗ/ فَاُولٰٓئِكَ، فَاُولٰٓئِكَ،
فَاُولٰٓئِكَ، فَاُولٰٓئِكَ/ اَصْحٰبُ، اَصْحٰبُ. اَصْحٰبُ/ النَّارِ (مثل سابق)
هُمْ، هُمْ/ فِيْهَا، فِيْهَا، فِيْهَا، فِيْهَا/ خٰلِدُوْنَ، خٰلِدُوْنَ،
خٰلِدُوْنَ/ وَالَّذِيْنَ، الَّذِيْنَ، اَلَّذِيْنَ، اَلَّذِيْنَ/ اٰمَنُوْا، اٰمَنُوْا،
اٰمَنُوْا، اٰمَنُوْا/ وَعَمِلُوا، عَمِلُوْا، عَمِلُوْا/ الصّٰلِحٰتِ،
اَلصّٰلِحٰتِ، اَلصّٰلِحٰتِ/ اُولٰٓئِكَ (مثل سابق) اَصْحٰبُ (مثل سابق)
اَلْجَنَّةِ، اَلْجَنَّةِ، اَلْجَنَّةِ/ هُمْ/ فِيْهَا/ خٰلِدُوْنَ (ہر سہ مثل سابق)

TO CHRISTIANS
WITH LOVE

Based on the lectures delivered by
Dr. Israr Ahmad

Price Rs. 8.00

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore

would face comparatively less opposition and resistance in a country governed by Muslims than in one ruled by a colonial power, it can be rightly claimed that the various movements for independence actually represented an initial stage in the process of Islamic Renaissance.

However, if it is objected that these struggles for liberation were led by people who were not, in most cases, practicing Muslims, then a saying of the Holy Prophet (Peace be upon him) can explain this phenomenon. According to this prophetic saying, Almighty God sometimes chooses irreligious and grossly impious people for the service of Islam (Bukhari). Indeed, His plans are highly precise, yet mysterious and subtle.

We know that various regional and ethnic sentiments were invoked in order to mobilize the masses in the course of these movements for independence. Again, strictly speaking, these slogans had absolutely nothing in common with Islam. However, the degree of emotional attachment and intellectual devotion of the Muslims with Islam was certainly not strong enough for it to become the basis for a dynamic and effective movement. Under these circumstances, therefore, the use of nationalistic slogans in such movements can be justified to a large extent. In principle, it can be said that such methods are permissible only when they are used on a temporary basis – as a matter of pure expediency – and not adopted as a permanent ideology. In countries where such sentiments were aroused to get rid of the foreign rule, it is imperative that after the achievement of political autonomy the true Islamic spirit of Muslim unity and brotherhood be cultivated.

To Be Continued

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Moreover, this mission of the renaissance of Islam and revitalization of the Ummah is not going to be completed in ten or twenty years; rather, it requires a slow and patient ascent from one rung of the ladder to the next. Each and every step in this upward movement is worthy and crucial in its own right. It is possible for the work done by one's predecessors to appear trivial or even misplaced and misguided when viewed from a higher level. However, the significance and value of the contributions of the past generations cannot be easily disparaged or denied, keeping in view the specific requirements and limitations of the time and circumstances in which they were carried out. Finally, while the importance of charismatic personalities is certainly undeniable, in the final analysis they are of less value as compared to organized groups and parties. These associations, in turn, tend to lose their unique significance within the larger umbrella of particular movements, and, finally, all these different movements coalesce in the all-embracing process of revival and regeneration, which is what really matters.

First Stage of Revival

Strictly speaking, Islam and Muslims are two completely distinct entities, and as such the independence of Muslim territories from direct Western occupation should have nothing to do with the revival of Islam. However, if we are to consider this issue from a realistic perspective instead of a purely theoretical point of view, the whole situation appears quite different on the ground. That is to say, for all practical purposes, the future of Islam is inexorably linked with the Muslim nations as they exist today, and both of them – though theoretically unconnected – are in reality dependent upon each other.

Thus, the achievement of independence and self-determination by different Muslim nations, in fact, constitutes the first stage in the revival of Islam. Although Western domination is still very much present in the form of our intellectual, cultural, and financial slavery, the whole Muslim land except for Palestine and Kashmir are, by the grace of Almighty God, now free from direct foreign rule. Since the efforts for Islamic revival

It is apparent to any careful observer that the Jews have continued to suffer the floggings of Divine punishment in the present century Holocaust being a case in point just as they have been suffering for the last two thousand years. Simultaneously, however, they are also undergoing a process of revival, as exemplified by the establishment of the state of Israel. In the same way, the second phase of decline for the Muslims has continued in this century -- prominent examples of which include the end of Ottoman Empire, abolition of the Caliphate, the Six-Day War of '67, fall of East Pakistan, and the devastation of Iraq in the Gulf War but, at the same time, powerful currents of Muslim revival are also visible, as epitomized by Islamic activism throughout the world.

According to the premonitions of Qur'an and Hadith, the process of Muslim re-awakening and revitalization is going to continue, culminating not only in the renaissance of Islam as a moral and spiritual ideal, but also in the establishment of the Islamic System of Social Justice over the entire globe. On the other hand, the revival among the Jews is going to be evanescent, and their continuing decline, in due course of time, will overshadow their apparent "rise", ultimately leading to their final and total extermination. Moreover, the beginning of the domination of Islam and the annihilation of Jews will be temporally coincidental. The relevant predictions in the Qur'an and Hadith will be discusses later in this book. At the moment we shall consider the dynamics and details of the process of revival among the Muslims.

Moving Upwards

The most significant point in this respect is that Muslim revival is not a simple and linear process, but that it has numerous aspects and various dimension. There are a number of devoted individuals, as well as associations and organized groups, which are working diligently in different fields of Islamic revival. Although their work may sometime appear to be mutually conflicting, the fact remains that all of them are actually reinforcing each other vis-à-vis the overall movement for revival.

Muslim unity and their *esprit de corps*. Although Muslims were never a single political entity after the Umayyads, they still remained thoroughly connected and unified because of their common beliefs and life-style. However, the seeds of racial prejudice and nationalistic chauvinism – planted by the Western Imperialism in the beginning of the 20th century – not only weakened that sense of brotherhood and ultimately led to the winding up of Caliphate, but are still producing their sinister fruits in the form of our growing disunity.

This malignant trend of fragmentation along ethnic, territorial, and linguistic lines has resulted in the carnage suffered by the Turks at the hands of their Arab brother, and the massacre and derogation of non-Bengali Muslims at the hands of Bengali Muslims in what was then East Pakistan. The insanity of fratricide, according to the Qur'an, is one of the manifestations of Divine punishment:

> Say: "He has power to send you retribution form the skies above, or the earth beneath your feet, or confound you with divisions among you, and give one the taste of the vengeance of the other." (6:65)

BACK TO THE PRESENT

So far we have examined the similarities between the Jewish and Muslim histories vis-à-vis their two phases of rise and two phases of decline. In this context, the events of the 20th century are especially significant in that they represent – for both the Jews and the Muslims – the unfolding of the third and final stage of their respective histories.

Note that although "rise" and "decline" are essentially opposite and contradictory concepts, whenever we consider the history of a culture-civilization, we find these two processes in an inseparable amalgam. At any given moment in the history of a people, both processes are found operating side by side, although in due course of time one of these gradually weakens and disappears, and the surviving trend becomes dominant.

Portuguese, Dutch, British, and French traders-cum-conquerors, who, from 16th to 19th centuries, continued to occupy various Muslim states, exploiting all human and natural resources to their fullest. Moreover, just as the Jews were strongly influenced, during the Greek and Roman rule, by the language, culture, life-style, values, and ideas of their rulers, so were the Muslims.

By now the Ottoman Empire was in serious disarray, resulting from injustices by those in authority, decline in morality, widespread corruption, and, worst of all, lethargy and stagnation of the intelligentsia. The power vacuum created by the weakening Turks was an open invitation for the Western Imperialism to subjugate the heart of the Muslim world. And, indeed, they were only glad to oblige.

The beginning of 20th century turned out to be the starting point for the second phase of decline in the heart of Muslim world. Thus, the British Intelligence masterminded the Arab revolt against the Turks during World War I, resulting in the segmentation of the great Ottoman Empire. Numerous smaller states were created in the Middle East and north Africa, which came under direct or indirect control of different European powers. In this way, a prediction of Prophet Muhammad (Peace be upon him) came true, i.e., "There will come a time when nations of the world will invite one another to invade and exploit you, just as a person calls upon his guests to the feast" (*Abu Daud*).

The second phase of Muslim decline reached its lowest ebb during the first quarter of the present century, when the whole of Muslim world was enslaved by the forces of Western Colonialism. Then, in 1967, the Arabs received their most ignominious defeat at the hands of a cursed nation, when the sanctity of Al-Aqsa mosque was violated for the second time, and the Holy City was captured by Israeli army. In this was the words of the Qur'an -- "When the time of the second prediction came, (We roused against you another people) to ravage you, and to enter the Temple as they had done the first time, and to destroy utterly what they conquered" (17:7) -- were fulfilled once again.

The most tragic and lamentable aspect of this history is the fact that the Western Imperialism had succeeded in destroying

into Austria, and later in 1683, when they again reached up to the gates of Vienna.

Second Period of Decline

The period between 1350 and 1600 is characterized by the revival of cultural and scientific development in Europe, usually referred to as "Renaissance". It is an undeniable historical fact that this movement was triggered under the influence of the unusual preoccupation of Muslims with science and knowledge. The Middle Ages were, for the Christian Europe, a period of intellectual stagnation. The birth of the scientific method and inductive logic, along with discoveries in astronomy, physics, geology, botany, medicine, and mathematics – all were taking place in the Muslim world. Greek, Indian, and Persian sciences were being taught in the universities of Muslim Spain, which attracted scholars from all over Europe. In this way, the light of reason and science reached and started to illuminate the darkness that was mediaeval Europe.

Unfortunately, the development of science and technology in Europe coincided with the downfall in Muslim political power. By now the Arab rule in Spain – established by Abdur Rahman in 750 – was in decay. Muslim Spain, therefore, became the first target of European imperialism, culminating in the fall of its last stronghold, Granada, in 1492. Today, all the magnificent architecture of the Umayyads is still standing, but Muslims and Muslim culture have completely vanished from modern Spain, as if they had never existed there. Weakness, as they say, is indeed a capital crime.

Prince Henry of Portugal had ordered, in the 15th century, to find a sea route to India. Various expeditions were only partly successful, until Vasco da Gama became the first European explorer to finally reach India by sea, in 1497, by traveling northwards after going around the Cape of Good Hope, at the southern tip of Africa. European Imperialism, which was as yet unable to colonize the Muslim lands in Asia because of the strong Ottoman Empire, was now in a position to launch her offensive through sea route. What followed was an onslaught of

to Jerusalem in the 6th century B.C., when Prophet Uzair was overwhelmed with grief and had, according to the Qur`an, said to himself, "how shall God bring this city to life after its death?" (2:259). But despite the widespread devastation and depression, just as the Israelites had risen again, so did the Muslim, and the words of the Qur`an – "Then we gave you a chance against them, and strengthened you with wealth and children, and increased your number" (17:6) – were fulfilled once again.

There was, however, a significant departure from the pattern set by the Jewish history. The previous Muslim ummah was composed of single race, and therefore their renaissance had to take place exclusively from within that race. There was no such limitation in the case of the present Muslim Ummah, and, as a result, the process of her revival was accomplished by the efforts of a number of non-Arab nations.

Almost miraculously, the barbaric Mongols themselves started to embrace Islam, and this provided the Muslim world with powerful defenders and guardians. Similarly, the Temurid and Ottoman Turks also converted to Islam, the former laying down the foundations of a strong Muslim dominion in India, thereby strengthening the eastern wing, and the latter establishing themselves initially in Asia Minor and then founding the Great Ottoman Empire.

The terms "Turkey" and "Ottoman Empire" are sometimes treated as synonyms, although present-day Turkey constituted only a small part of that largest of all modern states – extending into Asia, Europe, and Africa. The capital of Byzantine or the Eastern Roman empire, Constantinople, was conquered by Muhammad II in 1453 and became the Ottoman capital. The Turks were then able to establish their domination over the whole east Europe, and also accepted the challenging and stupendous talk of protecting and leading the heart of the Muslim land, including north Africa. Moreover the Caliphate was revived, and the past greatness of the Muslims was recaptured in its totality, although this was achieved by the efforts of the Turks, and not by those of the Arabs. The Ottoman empire reached its zenith under Selim I and his son Suleiman the Magnificent in the 16th century, when the Turk armies advanced through the Balkans and Hungary

after uniting the Mongol tribesmen, had already established a ruthless and powerful army that plundered North China, Turkestan, Transoxania, Afghanistan, and Persia. After Genghis Khan's death, his empire was divided among his sons and grandsons. The fierce Mongol warriors, however, continued to advance further east, towards the heart of Muslim land. The destruction of the romantic city of Baghdad in 1258 was brutally thorough, as most buildings were razed to the ground. For a period of forty days, the conquerors continued to massacre the inhabitants, even pregnant women were not spared. Dead bodies in street and market places were too numerous to be properly buried, leading to uncontrollable epidemics of disease which further added the to the death toll. The whole social and economic framework collapsed, along with the rich traditions of culture and learning. With the execution of Mu'tasim Billah, the already flickering lamp of the Abassids Caliphate was also extinguished.

The fall of Baghdad was not only the last episode in the first manifestation of Divine punishment to the Muslims, but it also constituted the *coupe de grace* for the *Banu Ismael*, as Almighty God sacked them from the leadership of the Muslim world. The following Qur'anic words came true, at least regarding the Arabs:

> If you turn away, then God will bring other people in your place, who will not be like you. (47:38)

Life After Death

The Arabs were too severely crushed to stop the roaring and raging storm of Mongol invaders. It was the Mamluke ruler of Egypt - Saifuddin Kutuz (*Al-Malik Al-Muzaffar*) who defeated them for the first time in 1260, thereby shattering the myth of Mongol invincibility. After him, Ruknuddin Baybras inflicted several defeats on the Mongol armies, forcing them out of Syria. In this way, at least the western wing of the Muslim world was saved from destruction.

During the 12th and 13th centuries, however, the center of the Muslim land was presenting a desolate and hopeless picture. The situation there was a repetition of what had happened

shrouded for some time, it became increasingly obvious by the 10th century that the Arabs were reaching their senility.

During the 11th century, Arab decline and decadence became severe enough to create a power vacuum in the heart of the Muslim world. This attracted tribes from the north east, i.e., Kurds and Seljuk Turks, to the center of the Muslim land. These tribes, after embracing Islam, strengthened their hold in Syria, Palestine, and Egypt. In this way fresh and energetic blood was infused into the ailing Muslim Ummah. Moreover, it was during this period that Afghan tribes started invading the Indian subcontinent, paving the way for the establishment of Muslim rule in India.

In the 12th and 13th centuries, the Arabs experienced their first taste of Divine punishment, and the words of the Qur'an "We sent against you Our creatures full of martial might who ransacked your cities" -- were fulfilled once again. Previously, the Jews were destroyed by the Assyrians from the north and then by the Babylonians from the east. History was repeated when the Arab Muslim were devastated first by the Crusaders from the north, and then by the Mongols from the east.

The Christian Europe launched a series of attacks, in order to recapture Jerusalem form Muslims, after Pope Urban II had demanded, in 1096, a Holy War to liberate the city from "infidels". Wave after waves of Crusaders invaded the Muslim territories for the next two hundred years. During one of their initial attacks, the Crusaders conquered Jerusalem in 1099, violating the sanctity of Al-Aqsa mosque. The Christian warriors, in their extreme religious frenzy, went completely berserk after this conquest. Such wholesale butchery took place in Jerusalem that it embarrasses the Western historian even today.

The Holy City remained under Christian rule for a period of 88 years, as the decrepit Umayyads were no longer capable of launching an offensive. Finally, the fervent and zealous elements from among the non-Arab nations -- under Salahuddin Ayyubi (1137-1193), an Egyptian ruler of Kurdish descent -- fought successfully against the Crusaders and brought Jerusalem again under the Muslim rule in 1187. The real extermination of the Arabs, however, was still to come. Genghis Khan (1162-1227),

However, with the passage of time, the zeal of establishing the Just Social Order of Islam had started to diminish, and the element of Arab Imperialism was beginning to dominate the Muslim conquests.

The supremacy of Muslims reached its zenith during the 8th, 9th and 10th centuries C.E., when initially the Umayyads and then the Abbasids held the leadership of Islam as well as that of Muslims. Strictly speaking, however, only the Umayyad era represents the true domination of pure Arab rule, as the Abbasids were generally infected and spoiled by Persian influences. Still, during this period, *Banu Ismael* were in ascendancy over a big chunk of land, and their culture, civilization, arts, sciences, and religion were dominant. The first three hundred years can therefore be described as the golden era of Muslims.

At this juncture, a point of contrast between the Muslims and the Jews becomes apparent. That is, while the first phase of rise for the Muslims began during the life time of Prophet Muhammad (Peace be upon him), the corresponding period for the Jews could not start until about three hundred years after Moses. The reason for this difference is that the establishment of Islam as a politico-socio-economic system was achieved, at least within the boundaries of Arabian Peninsula, by Prophet Muhammad (Peace be upon him) and his devoted companions. On the other hand the Israelites, by refusing to fight for the Promised Land, had brought the revolutionary process to a halt. Hence the delay of three hundred years.

First Period of Decline

The Arabs gradually got corrupted as a result of their unprecedented power and wealth. The simple and frugal – almost self-denying – life style of the early Muslims slowly disappeared, giving way to the luxurious and hedonistic trend that is the hallmark of all worldly rulers. Due to their sybaritic and materialistic ambitions, the faith and religious enthusiasm of the Arabs faded away, leading ultimately to their political decline. Although clear signs of their hollowness and exhaustion remained

treated the previous Muslim ummah – the Jews – was repeated in His dealings with us. When we indulged in the same sins and crimes as were committed by the Jews, we received the same punishment as was given to them.

To begin with, we need to have in our minds a rough idea of the geography of Muslim world. For the purpose of description, it can be seen as consisting of three sections. That is, the *center* or the heart of Muslim world, which is made up of the Arabian peninsula in the south and Iraq, Palestine, Syria, and Asia Minor in the north; the *right wing*, which extends from Iran, Afghanistan, Pakistan, and Central Asian republics to Malaysia and Indonesia in the Far East; and finally the *left wing*, which includes the whole North Africa and, in the good old days, even Spain.

The Muslim Golden Age

Prophet Muhammad (Peace be upon him) was born in 571 C.E., in the predominantly pagan environment of Makkah, and started his mission around 610 C.E at the age of forty. After an exhausting and onerous struggle that spanned 23 years, the domination of Islam was established throughout the Arabian peninsula. Prophet Muhammad (Peace be upon him) had started the process of expansion, or export, of the Islamic Revolution into the neighboring countries before his death in 632 C.E. This expansion continued unabated during the Caliphate of Abu Bakr, Umar, and Usman (May God be pleased with them), when the *Banu Ismael* or the *Ummiyeen* gushed forth like a mighty flood, and in less than quarter of a century Iran, Iraq, Syria Palestine Egypt, as well as a major part of North Africa came under their rule. These were the days of pure, authentic, and pristine Islam.

After a brief respite due to internal turmoil during the Caliphate of Ali (May God be pleased with him), the process started again during the Umayyad era, and, within a short span of time, new lands were conquered that extended up to Turkestan, Afghanistan, and Sindh in the east, and included the entire North Africa and parts of Europe in the west. Spain was vanquished, and the Muslim armies reached even up to the heart of France.

Dr. Ahmed Afzaal

LESSONS FROM HISTORY-IV

Based on the Urdu Columns By: **Dr. Israr Ahmad**

Two of a Kind

The rationale behind going through all these details of Jewish history is to be able to see our faces in their mirror. Both the Muslims and the Jews claim to be the followers of a holy messenger of God and both were endowed with Divine Scriptures. This in itself constitutes a strong unifying factor, meaning that the two are essentially similar communities. According to a tradition that appears in *Jame' Tirmidhi*, Prophet Muhammad (Peace be upon him) is reported to have said: "My Ummah will undergo and experience all those conditions which were suffered by the Children of Israel, just as a shoe resembles its pair." The parallelism between the history of Muslims and that of Jews is indeed amazing. A comparative study of their past reveals that, like the Israelites, we Muslims have also undergone two phases of rise and two phases of decline, as alluded to by Prophet Muhammad (Peace be upon him) in the above prediction.

What follows, therefore, is a survey of the history of Muslims vis-à-vis their rise and decline over the last fourteen centuries, and this will clearly demonstrate the points of resemblance between the two communities.

The principal reason, however, for presenting this comprehensive yet brief chronological sketch of our past is two fold: First, as far as "rise" is concerned, we need to fully appreciate our past grandeur and glories, so that our younger generations can be motivated to recapture that lost greatness and to try and revive this half-dead tiger that was once the Muslim Ummah. Second, with reference to "decline", we need to clearly understand that God's Justice is the same for everyone, and His laws are permanent and immutable. The manner in which He

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں "بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر" کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

جو کئی سال سے آؤٹ آف پرنٹ تھی'

اب اس کتاب کا نیا نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے' جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے :

- فکر اقبال کی روشنی میں حالات حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں
  از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد
- حیات و سیرت اقبال
- فلسفہ اقبال
- ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام
  از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم
- اقبال اور قرآن' از قلم : سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت' دیدہ زیب طباعت' صفحات ۱۴۴

قیمت : اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے

اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن